قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

دسمبر 1959ء

صرف قرآن لکھو۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ (ص) لَا تَکْتُبُوْا عَنِّیْ شَیْئاً وَمَنْ کَتَبَ غَیْرَ الْقُرْآنِ فَلْیَمْحُہٗ ۔ (مسلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، مجھ سے (قرآن کے علاوہ) کوئی بات نہ لکھو، اور جس نے قرآن کے علاوہ کچھ اور لکھ لیا ہو وہ اسے مٹا ڈالے ۔

شائع کردہ :

ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵-بی گلبرگ لاہور

قیمت بارہ آنے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

بدلِ اشتراک
ہندوستان اور پاکستان سے :- آٹھ روپے
غیر ممالک سے :- ۱۶/- شلنگ

قیمت فی پرچہ
ہندوستان اور پاکستان سے
- بارہ آنے -

ٹیلیفون ۷۵۰۰
خط وکتابت کا پتہ :- ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
۲۵- بی ـــــ گلبرگ - لاہور

جلد ۱۲	دسمبر ۱۹۵۹ء	نمبر ۱۲

— فہرستِ مضامین —

لمعات		۲
یتیم پوتے کی وراثت		۷
سرسید احمد خانؒ	(محترم مقدر سلیمی صاحب)	۹
بیادِ علامہ اسلم جیراجپوریؒ		۱۸
نقد و نظر	(تفہیم ہند)	۲۳
مجلسِ اقبال		۲۵
جہانِ تازہ		۳۸
نحل اور نمل	(مولانا ابوالجلال ندوی صاحب)	۴۱
ایک خط اور اس کا جواب		۵۹
اسلام کی سرگزشت		۶۵
رابطۂ باہمی		۷۸

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

آپ دنیا کے مختلف ممالک پر نگاہ ڈالیئے۔ کوئی ملک شاہراہ ترقی پر کہیں آگے دکھائی دے گا۔ کوئی اس سے ذرا پیچھے دکھائی دے گا کوئی سست رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہوگا۔ لیکن اکثر ممالک ایسے بھی دکھائی دیں گے جو ہزاروں سال سے ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔ ان کے معاشرے کی ہر شے یوں ساکن اور جامد نظر آئے گی گویا کسی نے جادو کے ڈنڈے سے انھیں متحجر (FOSSILISE) کر دیا ہو۔ اس قسم کے معاشرے کا آپ نے اندازہ کرنا ہو تو (مثلاً) ٹیکسلا جایئے۔ وہاں آثار قدیمہ کا ایک عجائب گھر ہے۔ اس میں وہ مختلف اشیاء رکھی ہیں جو اُس شہر سے برآمد ہوئی تھیں جو ہزاروں سال ہوئے زمین کے نیچے دفن ہو گیا تھا اور جسے اب کھود کر نکالا ہے۔ یہ اشیاء کیا ہیں؟ چولہا، چمٹا۔ توا، پرات، چھکنی۔ دیا۔ مٹکا۔ بدھنی۔ زیورات، کپڑے۔ آلات کشاورزی (ہل وغیرہ) لوہار، نجار، سنار کی دوکان کے اوزار۔ بچوں کے مٹی کے کھلونے (گھگھو گھوڑے) وغیرہ وغیرہ۔ آپ ان چیزوں کو دیکھئے اور پھر سامنے کے گاؤں میں چلے جایئے۔ آپ دیکھیں گے کہ وہاں بھی یہ تمام اشیاء بعینہٖ اسی شکل میں موجود ہیں جس شکل میں یہ عجائب گھر میں رکھی ہیں۔ ایسا معلوم ہوگا گویا ان چیزوں کو اس گاؤں سے اٹھا کے وہاں رکھ دیا گیا ہے۔ اگر ادھر سے کہیں خانہ بدوش قبائل کی کوئی بڑھیا "لے بھولے" کی آواز دیتی ہوئی نکل آئے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے ٹوکرے کے گھگھو گھوڑے ہو بہو ویسے ہوں گے جیسے عجائب گھر کی شیشے کی الماری میں رکھے ہیں اور جن کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ وہ ہزاروں سال پہلے کے ہیں۔ اس کے برعکس آپ یورپ یا امریکہ کے کسی شہر میں جایئے۔ وہاں اگر کوئی شخص (مثلاً) سنہ ۱۹۴۰ء کے ماڈل کی موٹر کار پر جا رہا ہو تو سارے شہر کے لئے تماشہ بن جائے گا۔ وہاں ہر سال ماڈل بدل جاتا ہے۔

علمائے تہذیب و عمرانیات نے اس مسئلہ پر بڑی تحقیق کی ہے کہ مختلف اقوام و ممالک کی ترقی میں اس قدر تفاوت کیوں ہے؟ اس سلسلہ میں انھوں نے مختلف اسباب کی نشاندہی کی ہے لیکن ان میں ایک سبب ایسا ہے جسے بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ وہ سبب ہے جسے معلوم کرنے کے لئے آپ کو کسی ماہر تہذیب و عمرانیات کے پاس جانے کی ضرورت نہیں۔ اس کے لئے آپ اپنے گاؤں کے لوہار یا ترکھان کے پاس جایئے اور ان سے پوچھئے کہ وہ ہل ایسا کیوں بناتے ہیں۔ وہ بلا تامل کہہ دیں گے کہ اس لئے کہ "ہل ایسا ہی بنتا چلا آ رہا ہے" یا "ہمارے باپ دادا اسی قسم کا ہل بناتے تھے"۔ "میں نے اپنے استاد کو ایسے ہی ہل بناتے دیکھا ہے"۔ یہ جواب آپ کو اپنے گاؤں کے ترکھان ہی سے نہیں

ملے گا۔ آپ جس ترکھان سے پوچھیں گے وہ یہی جواب دے گا۔ اور ایک "ہل اور ترکھان" ہی پر کیا منحصر ہے، ہمارے ہاں زندگی کے مختلف شعبوں میں جو کچھ ہو رہا ہے، ان کے متعلق آپ جس سے پوچھیں گے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے تو اس کا جواب یہی ملے گا کہ

"ایسا ہوتے چلا آرہا ہے۔"

یا

"ہم نے اپنے اسلاف کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔"

تہذیب کا عظیم مؤرخ، رابرٹ برفا اپنی شہرہ آفاق کتاب تشکیلِ انسانیت (THE MAKING OF HUMANITY) میں لکھتا ہے کہ قدیم زمانے کے انسان کے پاس اپنے کسی کام یا فیصلہ کی تائید میں اس کے علاوہ کوئی اور "دلیل" نہیں ہوتی کہ "ایسا ہوتے چلا آرہا ہے"۔

> جو کچھ ہوتے چلا آرہا ہے۔ اس سے ذرا سا اختلاف کرنے کا تصور تک بھی اس کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ اور اگر کبھی اس قسم کا خیال اس کے ذہن میں آتا تھا تو وہ کانپ اٹھتا تھا۔ گویا اس سے کوئی گناہِ عظیم سرزد ہو گیا ہے۔

اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ

> اگر ہم دورِ حاضر کی نفسیاتی اصطلاح میں کہنا چاہیں تو یوں سمجھئے کہ "جو کچھ اسلاف سے ہوتے چلا آرہا ہے: اسے مقدس سمجھ لیا جاتا تھا۔ یہیں سے "مذہب" کا خیال پیدا ہوا۔

اس کی مزید وضاحت کرتا ہوا وہ لکھتا ہے کہ قدیم انسان کے نزدیک "مذہب" اس کے سوا کیا تھا کہ "جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے"۔ بندر کی طرح اس کی نقالی کرلی جائے یا جس طرح ہر پچھلی بھیڑ، اگلی بھیڑ کے پیچھے چلی جاتی ہے، اسلاف کے راستہ پر آنکھیں بند کر کے چلتے رہیں۔ (ص ۲۰)

عصرِ حاضر کے محققین اور مکتشفین جس نتیجے پر اس قدر کد و کاوش سے پہنچے ہیں، قرآن کریم نے اسے آج سے چودہ سو سال پہلے نہایت بلیغ اور واضح انداز میں بیان کر دیا تھا۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں دو ذہنیتیں متوازی چلی آرہی ہیں اور قدم قدم پر ان کا باہمی ٹکراؤ ہوتا ہے۔ ایک ذہنیت یہ ہے کہ جو کچھ مانو، عقل و فکر کی رُو سے مانو۔ دلائل و براہین کی رُو سے مانو۔ خدا کی سند سے مانو۔ اور جو کچھ کرو یہ سوچ کر کرو کہ میں ایسا کیوں کرتا ہوں۔ اس ذہنیت کے علمبردار حضرات انبیاء کرام تھے جو انسانوں کے سامنے خدا کا پیغام یہ کہہ کر پیش کرتے تھے کہ اسے علم و بصیرت کی رُو سے پرکھو اور اس طرح جب اسے اپنے لئے زندگی بخش پاؤ تو عقل و فکر کی رُو سے اس پر عمل کرو۔ یہ الدین کا مسلک ہے۔ اس کے برعکس دوسری ذہنیت "مذہب پرستوں" کی ہے جن کے پاس اپنے ہر تصور اور ہر عمل کی "دلیل" صرف یہ ہوتی ہے کہ ہم اُسی روش پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو چلتے دیکھا ہے۔ جس نے اول الذکر روش اختیار کی، وہ شاہراہِ ترقی پر آگے بڑھتا چلا گیا۔ جو ثانی الذکر راستے پر چلا وہ عذابِ جحیم میں ماخوذ ہو گیا۔ وہ رُک کر کھڑا ہو گیا۔ (جحیم، یعنی دوزخ۔ کے مادہ میں رُک جانے کا مفہوم ہے)۔ قرآن کہتا ہے کہ انسانیت کی تاریخ انہی دو متضاد ذہنیتوں کے ٹکراؤ کی داستان ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب حضرت نوحؑ نے اپنی قوم تک خدائی اقدار

کا پیغام پہنچایا تو اس کے جواب میں قوم نے کہا کہ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (۲۳/۲۴)۔ "ہم نے اپنے اسلاف سے ایسی بات نہیں سُنی"۔ اس لئے ہم اسے ماننے کے لئے تیار نہیں۔ جب حضرت صالحؑ نے اپنی قوم کو خدا کا پیغام دیا تو انھیں بھی اس کا یہی جواب ملا کہ ۔۔۔ اَتَنْهٰنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱/۶۲)۔ "کیا تو ہمیں ان کی عبودیت سے روکتا ہے جن کی عبودیت ہمارے آباؤ اجداد اختیار کئے چلے آرہے ہیں"۔ جب حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کہا کہ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ (۲۱/۵۲)۔ "ان مورتیوں کی کیا حیثیت ہے جن سے تم اس طرح چمٹے رہتے ہو؟" تو قوم کی طرف سے اس کا جواب اس کے سوا اور کچھ نہیں ملا کہ وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ (۲۱/۵۳)۔ "ہم نے اپنے اسلاف کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے"۔ اس لئے ہم بھی وہی کچھ کر رہے ہیں۔ جب حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو خدا کی محکومیت اختیار کرنے کی دعوت دی تو انھوں نے بھی یہ کہہ کر اس دعوت کے ماننے سے انکار کر دیا کہ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (۱۱/۸۷)۔ "کیا تیری صلوٰۃ تمہیں اس کا حکم دیتی ہے کہ ہم انھیں چھوڑ دیں جن کی محکومیت ہمارے اسلاف نے اختیار کر رکھی تھی"۔ یہی دعوت حضرت موسیٰؑ نے جب قوم فرعون کو دی تو ان کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں تھا بجز اس کے کہ اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۱۰/۷۸)۔ "کیا تو ہمارے پاس اس لئے آیا ہے کہ جس روش پر ہمارے اسلاف چلتے آئے ہیں ہم اسے چھوڑ دیں؟" اور جب خدا کے آخری نبیؐ نے یہی پیغام اپنی قوم کو دیا تو اس کے خلاف بھی ان کا ردعمل یہی تھا کہ مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ (۳۴/۴۳)۔ "اس شخص کا مقصد یہ ہے کہ یہ تمہیں ان کی عبودیت سے روک دے جن کی عبودیت تمہارے آباؤ اجداد اختیار کئے چلے آرہے ہیں"۔ غرضیکہ جس نبی نے بھی خدا کی طرف دعوت دی اُسے قوم کی طرف سے یہی جواب ملا کہ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ (۴۳/۲۲)۔ "ہم نے اپنے اسلاف کو ایک مسلک پر چلتے دیکھا ہے اور ہم انہی کے نقوشِ قدم پر چلتے ہیں"۔ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ (۴۳/۲۴)۔ "ان کا نبی ان سے کہتا کہ میں اگر تمہارے پاس ایسی بات لے کر آیا ہوں جو اس روش سے جس پر تمہارے آباؤ اجداد چلتے تھے تمہارے زیادہ صحیح راستہ کی طرف راہ نمائی کرے"۔ تو کیا تم پھر بھی اسی روشِ کہن پر چلتے رہنا پسند کرو گے؟ اس کا جواب بھی ان کی طرف سے یہی ملتا کہ ہاں! ہم پھر بھی اپنے اسلاف کے راستے ہی پر چلنا پسند کریں گے۔ (۴۳/۲۴)۔ اس لئے کہ حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا (۵/۱۰۴)۔ "ہم نے جس مسلک پر اپنے اسلاف کو پایا وہ ہمارے لئے کافی ہے"۔ اس کے بعد ہم اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے کہ کسی دوسری بات پر غور کریں۔

قرآن کہتا ہے کہ ان دونوں ذہنیتوں کے ٹکراؤ میں ہر مقام پر اور ہر زمانے میں یہی ہوا۔ جس قوم نے آنکھیں بند کر کے اسلاف کی روش پر چلتے رہنے پر اصرار کیا اور اپنی عقل و فکر سے کام لینے سے انکار کر دیا وہ بالآخر تباہ و برباد ہو گئی۔ اور جس نے خدا کی رہنمائی کی روشنی میں عقل و فکر سے کام لینا شروع کر دیا وہ شاہراہِ ترقی پر آگے بڑھتی گئی۔ جب اس نے کبھی اس روش کو چھوڑ دیا تو یہ بھی اسی مقام پر رُک کر کھڑی ہو گئی۔ اس "رُک کر کھڑے ہونے" میں معاملہ اگر لوہار، ترکھان تک رہے تو یہ قوم مادی ترقی میں دوسری قوموں سے پیچھے رہتی ہے (اور بُری طرح پٹتی ہے) لیکن رُک کر کھڑی ہونے والی قوم زندگی کے ہر شعبے میں رُک کر کھڑی رہتی ہے۔ اس لئے اس کا یہ جمود و تعطل مادی مصنوعات سے آگے بڑھ کر فکری اور قلبی صلاحیتوں کو بھی اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے۔ اس سے یہ قوم شرفِ انسانیت سے بھی محروم رہ جاتی ہے اور یوں

اس کی دنیا اور عاقبت دونوں تباہ ہو جاتے ہیں۔

اسلام نے نوعِ انسان کی راہ نمائی کے لئے ایک ضابطۂ حیات دیا جس کے اصول غیر متبدل اور جس کی اقدار مستقل تھیں۔ اس نے انسانوں کو دعوت دی کہ تم علم و بصیرت سے اس پر غور کرو اور جب تم مطمئن ہو جاؤ کہ یہ تمہاری فلاح و بہبود کے ضامن ہو سکتے ہیں تو بطیبِ خاطر انہیں اختیار کرو۔ پھر ان کی روشنی میں اپنی عقل و فکر سے کام لیتے ہوئے اپنے مسائل کا حل دریافت کرو اور یوں شاہراہِ حیات پر آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ اسلام گویا اُس ذہنیت کے خلاف انقلابی آواز تھا جس کی رو سے کہا یہ جاتا تھا کہ ہم نے فلاں راستے کو اس لئے اختیار کیا ہے کہ ہمارے اسلاف اسی راستے پر چلتے آئے ہیں۔ اس نے انسانوں سے برملا کہہ دیا کہ اپنی عقل و فکر سے کام نہ لینا اور جس راستے پر آگے جانے والے چلے آ رہے ہیں، آنکھیں بند کئے اسی راستے پر چلتے جانا انسانی روش نہیں، حیوانات کی روش ہے جنہیں عقل و فکر دی ہی نہیں گئی۔ تم جو کچھ بھی کرو، اس کے لئے تمہیں خود معلوم ہونا چاہیئے کہ تم ایسا کیوں کرتے ہو؟ تم اپنے ہر فیصلہ کے لئے خود ذمہ دار اور مسئول ہو۔ کسی اور کا فیصلہ نہ تمہارے لئے سند ہو سکتا ہے نہ اس کے نتائج سے تمہیں بری الذمہ قرار دے سکتا ہے۔ اصولی طور پر تمہارے ہر فیصلہ کی سند اللہ کی کتاب ہے اور تمہارے ہر عمل کی علت (کیوں؟) کا جواب تمہاری عقل و فکر کے ذمہ ہے۔ یعنی اگر تم سے پوچھا جائے کہ تم نے فلاں معاملہ میں یہ اصول کیوں اختیار کیا تو اس کے لئے تمہارے پاس خدا کی کتاب کی سند ہونی چاہیئے اور اگر یہ پوچھا جائے کہ اس اصولی فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لئے تم نے فلاں طریق کیوں اختیار کیا تو اس کے لئے تمہیں عقلی دلائل دینے ہونگے۔ یہ جواب کہ میں یہ کام اس لئے کرتا ہوں کہ میرے آباؤ اجداد اسے اسی طرح کرتے تھے، کوئی جواب نہیں۔

غور کیجئے کہ قوموں کے زوال اور انحطاط کے متعلق جس بنیادی علت (CAUSE) تک عصرِ حاضر کے مفکرین اور محققین مدت العمر کی کاوش و کاہش کے بعد پہنچے ہیں، قرآن کریم نے اسے اتنا عرصہ پہلے کس طرح واشگاف انداز میں بیان کر دیا تھا چنانچہ جب مسلمانوں نے اس اصول پر عمل کیا تو وہ دنیا کی ہر "مذہب پرست" قوم پر غالب آ گئے اور شاہراہِ حیات میں، اپنے زمانے سے کہیں آگے نکل گئے۔ "مذہب پرست" طبقہ سے مراد تمام وہ اقوام ہیں جو "اسلاف کی روش" کو اپنے لئے سند تسلیم کرتی تھیں اور ان سے ایک انچ اِدھر اُدھر ہٹنے کے تصور سے کانپ اٹھتی تھیں۔ یہ قومیں مسلمانوں کے مقابلہ میں جہاں بھی آئیں، انہوں نے بُری طرح شکست کھائی۔ ان کا شکست کھا جانا، تقاضائے جرم تھا۔ اس اٹل اصول کے مطابق تھا جس کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔ ان کے پاس نہ اصولی طور پر خدا کی سند تھی نہ ہی اپنے پروگرام کے لئے عقل و فکر کی دلیل۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک عرصہ کے فکری تعطل سے ان کی غور و تدبر کی صلاحیتیں ہی سلب ہو چکی تھیں۔ یہ قومیں بھلا اس قوم کے سامنے کس طرح ٹھہر سکتی تھیں جس کے پاس راہ نمائی کے لئے خدا کے ابدی حقائق ہوں اور جو اپنا ہر قدم سمجھ سوچ کر اٹھائے اور اسے معلوم ہو کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟

اس دور کے بعد کیا ہوا؟ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں۔ لیکن اس کا جو نتیجہ نکلا، وہ آج ہر محراب و منبر سے بلند ہونیوالی آوازوں سے ظاہر ہے۔ آپ علمائے کرام سے دین کے متعلق کوئی بات پوچھئے۔ جو کچھ وہ جواب میں کہیں اس کے متعلق اتنا دریافت کر لیجئے کہ اس کی سند کیا ہے؟ اس کا جواب آپ کو اس کے سوا کچھ نہیں ملے گا کہ ہمارے اسلاف کا یہی مسلک ہے۔ بزرگوں سے یہی ہوتا

چلا آرہا ہے۔ فلاں امام نے یہ کہا ہے۔ فلاں مفسر کا یہ ارشاد ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ یعنی ما وجدنا علیہ اٰباءنا کی وہی ذہنیت جس کے خلاف حضرات انبیاء کرامؑ برابر جہاد کرتے رہے۔ اور جس کے خلاف آخر الامر قرآن ایک انقلابی صدائے احتجاج بن کر آیا۔ یہی ذہنیت ہماری روشِ زندگی کی بنیاد بن گئی ہے اور اس طرح خدا کا دیا ہوا دین، اسی مذہبی سطح پر آگیا ہے جو اقوامِ سابقہ کا مسلک تھا اور جن کی تباہی اور بربادی کی داستانیں قرآن نے اس مقصد کے لئے بیان کی تھیں کہ قرآن کو ماننے والی قوم ان سے عبرت حاصل کرے۔

آپ سوچئے کہ اس قدر واضح حقیقت کے بعد کیا اس بات کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ ہم تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کر کے یہ دریافت کریں کہ ہمارے زوال کے اسباب کیا ہیں؟ کیا آپ ایک لمحہ کے لئے بھی تصور کر سکتے ہیں کہ جس ذہنیت اور مسلک کا نتیجہ، اقوامِ سابقہ کے لئے تباہی اور بربادی کا موجب ہوا تھا، وہی ذہنیت اور مسلک ہمارے لئے عزت اور عروج کا موجب بن جائیں گے؟ یہ تو سنۃ اللہ کے خلاف ہے۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں۔ ان کی خلاف ورزی کا جو نتیجہ اقوامِ سابقہ کے حق میں برآمد ہوا تھا بعینہٖ وہی نتیجہ ہمارے لئے مرتب ہوگا۔ "مرتب ہوگا کیا؟ وہ تو مرتب ہو کر ہمارے سامنے آچکا ہے۔ صدیوں سے ہم جس ذلت اور پستی کے عذاب میں گرفتار ہیں وہ خود اس حقیقت کی زندہ شہادت ہے کہ قوانینِ خداوندی کی خلاف ورزی سے جو کچھ اقوامِ کہن کے ساتھ ہوا وہی کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے۔

اقوامِ سابقہ میں اور ہم میں ایک بنیادی فرق ہے۔ ان اقوام کے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں باقی نہیں رہی تھی اسلئے انھیں خدا کا راستہ دکھانے کے لئے ایک نیا نبی آتا تھا۔ ہمارے پاس خدا کی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود ہے۔ اس لئے نبی اکرمؐ کے بعد کسی نبی کی ضرورت نہیں رہی۔ ہمارے لئے آسان تھا کہ ہم دیکھ لیتے کہ ہمارے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق ہیں یا نہیں لیکن اُس ذہنیت نے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ہماری یہ حالت کر دی ہے کہ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا..... (۲/۱۷۰) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جو کچھ خدا نے نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ نہیں، ہم تو اسی روش کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے اسلاف کو پایا ہے"۔

ہمارے قدامت پرست طبقہ کو جب بھی قرآن کی طرف دعوت دی جائے ان کی طرف سے ایک ہی سکہ بند جواب ملتا ہے۔ اور وہ یہ کہ "کیا تم قرآن کو زیادہ سمجھتے ہو یا یہ بزرگانِ کرام زیادہ سمجھتے تھے؟" اس طرح یہ لوگ بزرگوں کے احترام کو آڑ بنا کر اور عوام کی عقیدتمندیوں کے جذبات کو مشتعل کر کے اپنی خلافِ قرآن روش کی گویا سند حاصل کر لیتے ہیں۔ لیکن اس دلیل کی کمزوری بالبداہت واضح ہے۔ سوال یہ ہے کہ جو کچھ ہمارے پاس متوارث چلا آرہا ہے اگر اسے کتاب اللہ کی روشنی میں پرکھنے کی قطعاً ضرورت نہیں تو پھر ہمارے لئے کتاب اللہ کا فائدہ کیا ہے؟ اسے کیوں قیامت تک کے لئے محفوظ رکھا گیا اور اس میں ہر زمانے کے مسلمانوں کو تدبر و تفکر کا حکم کیوں دیا گیا؟ جہاں تک اسلاف کے احترام کا تعلق ہے، کسی متوارث روش کو قرآن کی کسوٹی پر پرکھنے سے اس احترام میں فرق نہیں آجاتا۔ اس کی وجوہات ظاہر ہیں۔ مثلاً

(۱) جو کچھ ہمیں اسلاف کی کتابوں میں ملتا ہے، اس کی کیا ضمانت ہے کہ وہ فی الواقعہ انہی بزرگوں کا لکھا ہوا ہے جن کی طرف وہ کتابیں منسوب ہیں۔ آج جبکہ طباعت کا انتظام اس قدر وسیع ہے بعض اوقات کتابوں میں اس قسم کی غلطیاں ہو جاتی ہیں جو مصنف کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتیں۔ تو اس زمانے میں جب لوگ اپنے اپنے طور پر کتابیں لکھا کرتے تھے دانستہ یا نادانستہ غلطیوں کا احتمال بہت زیادہ تھا۔ یہ تو صرف کتاب اللہ ہے جس میں کسی غلطی کا امکان نہیں۔ اسلئے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لے رکھی ہے۔ لہٰذا ان بزرگوں کی کتابوں میں اگر کوئی بات ایسی ملے جو قرآن کریم کے

خلاف ہو تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ان کی کہی ہوئی بات نہیں ہے ان کی طرف غلط منسوب کر دی گئی ہے۔ یہی وہ مقامات ہیں جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِیْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْا..... (۲/۱۶۶) جب وہ بزرگ جن کی پیروی لوگ کرتے ہیں، یہ کہدیں گے کہ ہم ان لوگوں کے کاموں سے بری الذمہ ہیں: یعنی وہ کہدیں گے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ ہم نے ان سے کہا تھا کہ تم ایسا کرو، یہ غلط ہے۔ ہم نے کبھی ایسا نہیں کہا۔ لہٰذا بزرگوں کا صحیح احترام اس میں ہے کہ اگر ان کی کسی کتاب میں کوئی بات غلط نظر آئے تو بجائے اسکے کہ اس پر اصرار کیا جائے کہ انھوں نے ضرور ایسا کہا ہے، اسکے متعلق یہ کہدیا جائے کہ یہ بات ان کی نہیں ہو سکتی۔ کسی نے اسے ان کی طرف غلط منسوب کر دیا ہے۔

(۲) اگر کوئی مُصر ہو کہ وہ بات ضرور انھوں نے کہی ہے تو پھر ہم مجبوراً کہدینگے کہ ان سے بھی ہو گیا ہے۔ وہ بالآخر انسان تھے۔ انسان سے بھول چوک ہو سکتی ہے۔ ان کی ہر بات پر ایمان لانے کے لئے ہمیں مکلف نہیں بنایا گیا۔ قرآن نے اس باب میں ہمیں تعلیم یہ دی ہے کہ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (۲/۱۴۱)۔ یہ لوگ گذر گئے ہیں۔ جو کچھ انھوں نے کیا وہ ان کے لئے تھا۔ جو تم کرو گے وہ تمہارے لئے ہوگا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ انھوں نے کیا کیا تھا۔" اسلاف کے متعلق قرآن کی یہ تعلیم کس قدر صاف اور واضح ہے۔

(۳) زمانے کے تقاضے دن بدن بدلتے اور بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ اس لئے جو کچھ کسی نے کسی سابقہ زمانے کے تقاضے کے مطابق سمجھا تھا ضروری نہیں کہ وہ ہمارے زمانے کے تقاضوں پر بھی پورا اترے۔ یہ صرف خدا کی کتاب ہے جس کے غیر متبدل قوانین ہر زمانے کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ اسلاف کا صحیح احترام اس میں ہے کہ انھوں نے اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق خدا کی کتاب کو سمجھا اور سمجھایا۔ وہ خدا کی طرح عالم الغیب نہیں تھے کہ آنے والے زمانوں کے تقاضوں کا بھی علم رکھتے۔

لہٰذا ہمارے لئے صحیح مسلک یہ ہے کہ ہم زندگی کے ہر معاملہ کے لئے خدا کی کتاب سے راہ نمائی حاصل کریں اور اسکی روشنی میں اپنی عقل و بصیرت سے کام لیکر اپنے زمانے کے تقاضوں کا حل آپ دریافت کریں۔ جو کچھ ہمیں اسلاف سے ورثہ میں ملا ہے اسے بھی اسی معیار کے مطابق پرکھیں۔ جو کچھ اس معیار پر پورا اترے، اس سے فائدہ اٹھائیں۔ جو اس کے خلاف ہو اسے الگ کر دیں۔ یہی وہ طریق ہے جس سے ہم ہر دو جہان کی سرفرازیاں اور سربلندیاں حاصل کر سکتے ہیں۔ فھل من مدکر۔

۲۔ یتیم پوتے کی وراثت

ہماری مروجہ شریعت میں یوں تو کئی احکام ایسے ہیں جو قرآن کریم کے صریحاً خلاف ہیں لیکن ان میں سے بعض ایسے ہیں جن کے نتائج کو دیکھ کر انسان خون کے آنسو رو دیتا ہے۔ مثلاً یتیم پوتے کو دادا کی وراثت سے محروم قرار دینا۔ یہ فیصلہ صرف یہ کہ قرآن کریم کے خلاف ہے بلکہ عام انسانی ہمدردی کے بھی نقیض ہے۔ لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ ہماری مروجہ شریعت کا یہی فیصلہ ہے اور اس کے علمبردار اس کے خلاف ایک لفظ تک سننے کیلئے تیار نہیں۔ مزید بدقسمتی یہ کہ یہی (خلافِ قرآن) فیصلہ "محمڈن لاء" قرار پا کر انگریزوں کے زمانے سے ملک میں نافذ چلا آ رہا ہے۔ اس سے کتنے مظلوم تباہ ہو چکے ہیں اور کتنے باعزت گھرانے خاک میں مل گئے، اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جو ان امور سے دلچسپی رکھتے ہیں۔

تشکیلِ پاکستان کے بعد مرکزی حکومت نے اس امر کی ہدایات نافذ کیں کہ جب ہندوستان میں متروکہ جائدادوں کے معاوضہ کا تصفیہ

کیا جائے تو اس میں سے یتیم پوتوں کو بھی حصّہ دیا جائے۔ حکومت کا یہ فیصلہ موجبِ تشکر و امتنان تھا کہ اس سے کم از کم ان خانماں برباد یتیموں کو سہارا مل جائے گا جو ہندوستان سے پاکستان آئے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا کسی صاحب نے حکومت کے اس فیصلہ کے خلاف مغربی پاکستان کی ہائیکورٹ میں اپیل دائر کی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت کو اس قسم کی ہدایات جاری کرنے کا حق حاصل نہیں جو ملک کے مروّجہ قانون کے خلاف جائیں۔ اس دوران میں ہم سے بہت سے احباب نے دریافت کیا کہ اس اپیل کا کیا فیصلہ ہوا ہے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ہائیکورٹ مذکور نے (۲۱) اکتوبر ۱۹۵۹ء کو اس اپیل کو نامنظور کر دیا ہے اور یہ فیصلہ دیا ہے کہ حکومت کو اس قسم کی ہدایات جاری کرنے کا حق حاصل ہے۔

اس فیصلہ کے متعلق بعض احباب کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ ہائیکورٹ نے یتیم پوتوں کی وراثت کے متعلق مروّجہ قانون کو غلط قرار دیا ہے۔ بات یہ نہیں۔ ہائیکورٹ نے اس قانون کو مسترد نہیں کیا۔ وہ اپنی جگہ بحال ہے۔ اس نے صرف اتنا کہا ہے کہ اس قانون کے باوجود، حکومت اس قسم کی ہدایات نافذ کر سکتی ہے۔ اس کا مطلب (جہاں تک ہم سمجھ سکے ہیں) یہ ہے کہ متروکہ جائدادوں کے فیصلے تو حکومت کی ہدایات کے مطابق ہوں گے لیکن مقامی جائدادوں کے فیصلے ملک کے مروّجہ قانون کی رُو سے ہوں گے جس کے مطابق یتیم پوتا اپنے دادا کے ترکہ سے حصّہ نہیں پا سکتا۔

جب (سابقہ) دستورِ پاکستان کے تابع، اسلامک لاز کمیشن کا تعین ہوا ہے تو اس قانون (اور اسی قسم کے دوسرے خلافِ قرآن قوانین) کی تبدیلی کا امکان نظر آتا تھا (اگرچہ اس میں بھی کئی ایک دشوار گذار مراحل تھے) لیکن دستورِ پاکستان کی تنسیخ کے ساتھ، وہ کمیشن بھی باقی نہ رہا اور ان قوانین کی تبدیلیوں کا سوال پھر التوا میں پڑ گیا۔ اب اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ

(۱) آئندہ آئینِ پاکستان میں یہ شق رکھ دی جائے کہ ملک میں نہ کوئی ایسا قانون باقی رہے گا جو قرآن کے خلاف ہو اور نہ ہی ایسا نیا قانون نافذ ہو سکے گا۔ اور

(۲) اس کے بعد حکومت بلا تاخیر ایک اسلامک لاز کمیشن مقرر کرے جو ملک کے مروّجہ قوانین کا قرآن کریم کی روشنی میں محاسبہ کرے اور جو قوانین قرآن کے خلاف پائے جائیں ان کی تبدیلی کے لئے فوری اقدام کرے۔

طلوعِ اسلام، تشکیلِ پاکستان کے یومِ اوّل سے اسی مقصد کے حصول کے لئے کوشش کر رہا ہے اور اس وقت بھی اس کی تمام کوششوں کا رُخ اسی منزل کی طرف ہے۔ چونکہ یہ چیز ہمارے قدامت پرست طبقہ کے "ما وجدنا علیہ آباءنا" کے مسلک کے خلاف جاتی ہے اس لئے وہ طلوعِ اسلام کی ہر ممکن مخالفت کرتا ہے۔ اس مخالفت کیلئے اس کے پاس کوئی دلیل اور سند ہے نہیں اس لئے اس نے فیصلہ کر رکھا ہے کہ طلوعِ اسلام کے خلاف ہر قسم کی بہتان تراشیوں اور کذب بافیوں سے کام لیا جائے۔ چنانچہ یہ جو آپ ہر طرف سے آوازیں سنتے ہیں کہ طلوعِ اسلام منکرِ حدیث ہے، منکرِ سُنّت ہے، منکرِ شانِ رسالت ہے۔ یہ سب اسی پراپیگنڈہ کی صدائے بازگشت ہے۔ طلوعِ اسلام صرف یہ چاہتا ہے کہ ہمارے معاشرہ میں جو کچھ قرآن کے خلاف ہو رہا ہے اُسے ختم کر دیا جائے اور ہر معاملہ کا فیصلہ کتاب اللہ کے مطابق کیا جائے۔ اگر آپ اس معاملہ میں طلوعِ اسلام سے متفق ہیں تو اس کی کوششوں کو بار آور بنانے کے لئے اس سے تعاون کیجئے۔

"اسلام آگے کیوں نہ چلا؟" اس سوال کے جواب میں محترم پرویز صاحب کا ایک اہم مقالہ آئندہ شمارے میں شائع ہو رہا ہے۔ وہ الگ پمفلٹ کی شکل میں بھی شائع ہو گا۔

سرسیّد احمد خاں

عظمتِ رفتہ کا داعی ـــــ اور ـــــ نشاۃِ ثانیہ کا نقیب

(از محترم صفدر سلیمی صاحب)

گذشتہ ایک صدی سے ہماری ملت نے (ہندوستان و پاکستان میں) زندگی کے مختلف شعبوں میں جو ارتقائی مراحل طے کئے ہیں اگر ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو سرسیدؒ کی شخصیت ان سب کا اولین محرک دکھائی دے گی۔ اندازہ لگایئے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں جسے ہماری ذلت و مسکنت اور زوال و انحطاط کا نازک ترین دور کہا جاتا ہے سرسیدؒ قوم کو موت سے بچانے کے لئے اٹھا۔ اُسے اس راہ میں بیک وقت برطانوی ملوکیت، ہندو کانگریس اور خود اپنی ہی قوم کے مذہبی اجارہ داروں کی شدید ترین مخالفت میں اپنے پیشِ نظر مقصد کی کٹھن منزلیں طے کرنی پڑیں اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو سرزمینِ ملت پر ان ننھے ننھے پودوں نے سر اُبھارنا شروع کر دیا تھا جو بالآخر گلکدۂ پاکستان پر منتج ہوئے۔

یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ کے نئے دور میں ابھی تک سرسیدؒ کے مقام کو کما حقہٗ اہمیت نہیں دی گئی۔ اسی احساس کے بنا پر طلوعِ اسلام میں محترم صفدر سلیمی صاحب کے قلم سے حیاتِ سرسیدؒ کے موضوع پر یہ سلسلۂ مضامین شروع ہو رہا ہے۔

زیرِ اشاعت مضمون میں سرسیدؒ کی شخصیت کو من حیث المجموع روشنی میں لایا گیا ہے۔ آئندہ اشاعتوں میں ان کی زندگی کے مختلف اور اہم گوشے الگ الگ قارئین کے سامنے آتے رہیں گے۔ امید ہے کہ سرسیدؒ کی یہ تعارفی تفاصیل قارئینِ طلوعِ اسلام کو ہماری نشاۃِ ثانیہ کے اس "طائرِ پیش رس" کے ان گرانقدر کارناموں سے متعارف کرا سکیں گی جو اس نے ہماری ملت کو موت سے بچانے اور عروج و اقبال کی طرف لے جانے کے لئے پورے عزم و استقلال کے ساتھ سر انجام دیئے۔ (طلوعِ اسلام)

آزادی اور استقلال کی متاعِ بے بہا سے مالا مال ہو کر آج ہم آزاد قوموں کی صف میں کھڑے ہیں لیکن ـــــ ٹھیک ایک صدی قبل ـــــ تصور میں لائیے تاریخ کا وہ دلدوز و جگر سوز منظر جب ماضی کے ہر بیش بہا سرمائے کو سرِ بازار لٹا کر ہماری ملت، مایوسی اور شکست کی ماتم سرا میں پے در پے زخموں سے نڈھال دم توڑ رہی تھی۔ یہی ملت تھی جس کے پیش رو عروج و اقبال اور فتحمندیوں کے پرچم اڑاتے سطوت و رش کے کاشانوں میں داخل ہوئے تھے۔ اور پھر صدیوں تک اپنی عظمت اور جاہ و جلال کے درخشندہ اور گہرے نقوش ثبت کرنے کے بعد اس نے ذہنی افلاس، معاشی بے چارگی اور سیاسی زوال کے خرابوں سے گذر کر موت کے ویرانوں کا رُخ کر لیا۔ اس کے قلب و نظر کی تابناکیوں پر درماندگی اور جمود کا گرد و غبار چھا گیا۔ اس کی زندگی کی نبضیں ڈوبنے لگیں اور وہ نازک گھڑی قریب تھی کہ اس جرمِ ضعیفی کی سزا میں قاضیٔ تقدیر کی بارگاہ سے اس کی موت کا فیصلہ صادر ہو جائے۔

عین اس وقت جبکہ پردۂ افلاک سے ہماری زندگی کا یہ سب سے اندوہناک حادثہ برپا ہوا چاہتا تھا۔ قومی زندگی کے ایک نامعلوم اور غیر معروف گوشے سے سرسید علیہ الرحمت ایسا گرانمایہ زعیم صبحِ امید کا ستارہ بن کر نمودار ہوا۔ اور اس نازک اور کڑے مرحلہ پر ملت بیچارگاں کا قافلہ سالار بن کر عرصۂ کارزار میں مردانہ وار کود پڑا۔ یہ جرأتِ رندانہ کس قدر صبر آزما ثابت ہوئی اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جہاں سرسیدؒ کو سیلابِ بلا کی بپھری ہوئی موجوں سے نبرد آزما ہونا پڑا وہاں اپنی ہی اس کشتی کے مسافر اس کے دشمنِ جان بن کر مقابلے میں آ گئے جسے بچانے کے لئے اس نے جان کی بازی لگائی تھی۔ بیگانوں سے بڑھ کر یگانوں کی کرم فرمائیاں تھیں جو کبھی اس کے پائے استقلال کے لئے نوکیلے کانٹے بنیں اور کبھی دشمنوں کے ہاتھ کی تلوار ثابت ہوئیں۔ لیکن خدا کی ہزاروں رحمتیں ہوں اس دیوانے پر جس کی دیوانگی نے بالآخر سب کو مات دی۔ اس کا جذبۂ صادق، اس کا عزم و استقلال، اس کا خلوص و ایثار اور جوشِ کردار، جذبِ دستی کے والہانہ کیف میں تمام موانعات کو زیر و زبر کرتے چلے گئے۔ مخالفت کی تند و تیز آندھیاں اس کے عزمِ صمیم کو غبار آلود نہ کر سکیں۔ بغض و عناد کے شعلے اس کے جذبِ دستی کی مسکراہٹیں نہ چھین سکے۔ حوادث کی بجلیاں اس کے ولولوں کو شکست نہ دے سکیں۔ مصائب و آلام کی تاریکیوں میں اس کے خلوص و ایثار کی آب و تاب ماند نہیں پڑی۔ اپنی محبوب ملت کی نشاۃِ ثانیہ اور عروج و اقبال کی بازآفرینی کے لئے وہ ہر دشمنِ ملت سے ٹکرایا۔ برادرانِ وطن سے لڑا۔ برطانوی سامراج کے مغرور اور اکڑباز نمائندوں سے لڑا۔ مذہب اور شریعت کے بزعمِ خود غلط اجارہ داروں سے لڑا۔ ایک سرسید کی تنہا جان تھی جو قوم کو موت کے چنگل سے بچانے کے لئے ایک ایک محاذ پر جو کھمی جنگ لڑ رہی تھی۔ وہ زندگی کے آخری سانس اور خون کے آخری قطرہ تک ہر محاذ پر مردانہ وار لڑتا رہا اور بالآخر زخموں سے چور چور ہو کر گرا۔ دمِ مرگ اس کے چہرے پر ایک کامیاب زعیم اور کامران قافلہ سالار کی سنجیدہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ اس کی بے مثال فتحمندیوں کا نشان تھی۔ وہ اپنی کشتی کو بھنور سے بچا کر اس کا رُخ ساحلِ مراد کی جانب پھیر چکا تھا اور اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کے لئے اس میکدے کے سینکڑوں کھیون ہار اب ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے تھے ـــــ اور یہی ہے ایک قافلہ سالار کی فتحمندیوں کی دلیل جسے کاتبِ ازل نے سرسید کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔ سرسید اس جہانِ رنگ و بو سے رخصت ہو گیا لیکن اس نمودِ سحر کے امکانات روشن کر گیا جو بالآخر مملکتِ پاکستان کی تشکیل سے فضائے عالم میں ضوفشاں اور جلوہ بار ہوئی۔ اس کے فکر و عمل کا عظیم ترین شاہکار، دارالعلوم علی گڑھ کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ اور آج کون ہے جو اس حقیقت سے

انکار کر سکے کہ ملت کے نونہالوں کی یہی وہ مرکزی تربیت گاہ تھی جس نے خاک کے ذروں کو ستاروں کی تابانیاں سکھائیں۔ سرسیدؒ کی معجز نمائیوں کا یہ سلسلۂ دراز تاریخ کا ایک سنہری ورق بن چکا ہے اور قوموں کی بگڑی بنانے کے سلسلہ میں یہ ہمیشہ ایک نشانِ راہ (LAND - MARK) کا کام دے گا۔

سرسیدؒ کی زندگی اور زندگی کی تگ و تاز اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ قیادت کے میدان میں وہ ایک جامع صفات شخصیت ثابت ہوئے۔ قومی خدمت اور قیادت کا کوئی شعبہ نہیں جس میں انھوں نے اپنی ملت کے لئے ایک نئی شاہراہ نہ کھول دی ہو۔ فکر و عمل کا کوئی میدان نہیں جہاں وہ اپنے معصروں میں سب سے ممتاز اور سرفراز نظر آتا ہو۔ پیشتر اس کے کہ ہم سرسیدؒ کی عظمت کے مختلف گوشوں کو سامنے لائیں اس سلسلہ میں ایک اہم نقطہ کی وضاحت ضروری ہے۔

آج ایک صدی کے بعد ماضی کے دھندلکوں سے سرسیدؒ کی عظمت کے نقوش کو ان کے حقیقی رنگ و روغن کی آب و تاب میں جانچنا غیر معمولی دقتِ نظر کا محتاج ہے۔ ان کے مکتبِ فکر سے اختلاف یا کسی دوسرے سطحی نقطۂ نظر کی بنا پر آج یہ کہنا بڑا آسان ہے کہ سرسید کے فکری و عملی کارناموں میں کوئی مخصوص امتیازی شان نظر نہیں آتی۔ یا یہ کہ انھوں نے فلاں معاملہ میں غلط قدم اٹھایا، فلاں مقام پر یوں ٹھوکر کھائی اور فلاں جگہ یہ فنی غلطی کی۔ سرسیدؒ کے نقاد یہ کہتے ہوئے اس حقیقت کو نظرانداز کر جاتے ہیں کہ سرسیدؒ کی شخصیت عصرِ حاضر کے کسی قائد کی شخصیت نہیں بلکہ اس کی عظمتِ کردار کا رابطہ ایک صدی قبل کے عہدِ رفتہ اور زوال پذیر قومی ماحول سے وابستہ ہے۔ اس ایک صدی میں ہم سینکڑوں کٹھن منازل اور ارتقائی مراحل سے گزر کر نئی منزل تک پہنچے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے آج کے قافلۂ بہار کا طائرِ پیش رس تھا لیکن سوچئے تو سہی کہ جس فضا میں وہ سرگرمِ پرواز ہوا اس میں صبحِ بہار کی کوئی شرمائی سی کرن بھی نظر آسکتی تھی؟ کیا ملت کے اجڑے ہوئے چمنستانوں میں خزاں کے سوا کچھ اور دکھائی دیتا تھا؟ اور کیا اس خزاں کی عمر دراز صدیوں تک پھیلی ہوئی نہیں تھی؟ کسی رجلِ عظیم کی عظمت کو کسی دوسرے دَور کے معیاروں پر پرکھنا مناسب اور درست نہیں ہوتا۔ دیکھنا یہی پڑے گا کہ اس نے کس ماحول میں آنکھ کھولی اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے پیچھے اُس ماحول کو کس انقلاب سے آشنا کر گیا۔ گردشِ ایام کبھی ماضی کی طرف نہیں پلٹ سکتی۔ لیکن وہ اکثر اوقات ماضی کے کارناموں کو گرد و غبار کے سپرد ضرور کر دیتی ہے۔ حسنِ نیت اور انصاف کا تقاضا ہے کہ سرسیدؒ کے معاملے میں بھی اس اصول کو نظرانداز نہ کیا جائے۔ اس زعیمِ ملت کی عظمت یا تو تاریخ کے ان مستقل پیمانوں اور معیاروں سے جانچی جائے گی جن سے ہر دور کا زعیم ماپا اور تولا جاتا ہے اور یا پھر اس کے اپنے دور اور ماحول کے ترازوؤں سے۔ اور یہ دونوں پیمانے اور معیار علیٰ رؤس الاشہاد بتائیں گے کہ سرسیدؒ کس قدر عظیم المرتبت قائد ثابت ہوا۔ وہ اپنے عزائم میں کس قدر مخلص اور صاحبِ ایثار تھا۔ اور کس قدر درخشندہ و تابندہ بلکہ لازوال ہیں اس کی کامیابی و کامرانی کے وہ نقوش جو اس کی طبیعی موت کے بعد اس کی غیر فانی عظمت کا نشان بن گئے۔ ترکی کی شہرۂ آفاق خالدہ ادیب خانم نے کس قدر درست کہا تھا:۔

"سرسید کو کسی پہلو سے بھی دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا بھاری پتھر تھا جو ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا اور اس نے جو لہریں برپا کی وہ آج تک برابر

حرکت میں ہیں خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جسے سرسیدؒ پسند کرتے۔ (حیاتِ جاوید)

جب ہم اس عظیم و جلیل قائد کی زندگی کے اوراق الٹتے ہیں تو شروع ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ سرسیدؒ ایک عام متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوئے یہ درست ہے کہ ان کے والد بزرگوار کا تعلق دربارِ مغلیہ سے تھا لیکن انیسویں صدی کے ان ایام میں مغلوں اور ان کے دربار کی بھلا حیثیت ہی کیا باقی تھی۔ اور لال قلعہ کی سنگین دیواروں سے باہر اس نام نہاد دربار کا دولت و اقتدار سے واسطہ ہی کیا رہ گیا تھا۔ مزید برآں یہ بھی ہوا کہ والدِ مرحوم کی وفات کے بعد سرسیدؒ اور ان کے خاندان کی گذر اوقات تک کی کوئی صورت نہ رہی۔ اس وقت سرسیدؒ نے بمشکل ابھی عالمِ شباب میں قدم رکھا ہی تھا کہ معاشی ذمہ داریوں کی بنا پر صدر امینی میں ایک معمولی سررشتہ دار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ سرسیدؒ کی زندگی کا حرفِ آغاز تھا۔ پھر وہ اپنی خداداد قابلیت سے منصفی؛ سول جج اور صدر امینی کے مناصب سے آگے بڑھتے ہوئے وائسرائے ہند کی لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت تک پہنچے۔ اور بالآخر سب سے بالاتر ہو کر قومی خدمت اور دارالعلوم کے لئے وقف ہو گئے۔

بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ سرسیدؒ کی زندگی کا یہ حصہ ایک جداگانہ اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور نہ تو یہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے متعلق ہے اور نہ ہی سرسیدؒ کی قائدانہ عظمت کے سلسلے میں ہم اسے بطور دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ اس نادرِ روزگار زعیم کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی۔ نوکر شاہی کی اسی سرزمین سے وہ چشمہ پھوٹا جس نے ملت کے اُجڑے ہوئے کشت زار میں سعی و عمل میں شادابیاں پیدا کر دیں۔ ملازمت کی اسی راکھ سے وہ شعلہ بھڑکا جس نے ہماری بے حسی اور جمود کے خرمنوں میں زندگی، حرکت اور عمل کی آگ کو جنم دیا۔ یہی تو وہ زندگی بخش معجزہ ہے کہ دفتری نظام کے جن سرد خانوں میں رگِ زندگی کی تپش مُردہ پڑ جاتی ہے، سرسیدؒ وہاں سے پُرسوز زندگی کی بجلیاں لئے نمودار ہوا اور ملک کے طول و عرض میں سکوں سوز ہنگامے بکھیر گیا۔ اپنی زندگی کے اسی دور کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا:-

> اپنی قوم کے لئے میں نے دور دراز کے سفر اختیار کئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب بھی کہیں میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی ہے۔ جب بھی میں نے مہذب اور صاحب علم انسانوں کی مجلسیں دیکھیں، جہاں کہیں عمدہ عمارتیں اور شگفتہ پھول نظر آئے۔ یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا، مجھے ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور رنجیدہ ہو کر بے ساختہ کہا کہ ہائے! ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟
>
> (حیاتِ جاوید)

ان چند الفاظ میں سرسیدؒ نے اپنے دل کی دھڑکنوں اور جگر کے زخموں کو ہمارے سامنے واشگاف کر کے رکھ دیا ہے۔ کس قدر تند و تیز شعلے تھے جو اس کے قلب و نظر کی پہنائیوں میں سلگ رہے تھے۔

سرسیدؒ کے خلاف ان کے مخالفین کا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ ساری زندگی برطانوی سامراج سے دوستی اور رفاقت کا حق ادا کرتے رہے اور اپنی قوم کو بھی اُس کے خلاف نبرد آزما ہونے سے باز رکھا۔ وہ قوم جو زندگی کی صلاحیتوں سے بے نصیب اور حقائق سے روگرداں ہو کر مدت سے جذبات کی رَو میں بہتی چلی آ رہی ہے اسکے گرمجوش حلقوں سے اس قسم کا الزام بعید از قیاس نہیں لیکن تاریخ کے

ان حقائق کی روشنی میں ذرا سنجیدگی سے سوچئے کہ اگر سرسید اعتدال کی اس راہ کو اختیار نہ کرتے تو ہمارا حشر کیا ہوتا؟ سرسیدؒ کی عقابی نگاہوں نے بخوبی بھانپ لیا تھا کہ مسلسل آرام کوشیوں اور عیاشیوں کے باعث جس قوم نے اپنی صدیوں کی سلطنت کے ساتھ زندگی کی ہر متاعِ عزیز تک کو بھی ہار دیا اس کا نئے حکمرانوں سے جو پہلے ہی جوشِ انتقام میں اُس کی رگِ حیات کاٹ دینے پر تلے بیٹھے تھے، لڑائی مول لینا موت اور خودکشی کو دعوت دینے سے کم نہیں۔ برادرانِ وطن ان طاقتور حکمرانوں سے محبت کی پینگیں بڑھا کر نوکرشاہی کے دفتری نظام میں ان کے دست و بازو بن رہے تھے اور دونوں کی ملی بھگت سے ایسی سازش بروئے کار آچکی تھی جو زندگی، عزت اور آبرو کے ہر میدان سے مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے تھی۔ قومی ہلاکت کی اس فضا میں انسانی فراست کا یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ سرسیدؒ کا قلم دلائل و براہین کی پوری قوت سے مسلح ہو کر حرکت میں آیا اور اُس نے برطانوی حکومت پر واضح کیا کہ مسلمانوں کو اپنا ازلی دشمن سمجھنا نہ صرف غلط فہمی پر مبنی ہے بلکہ بددیانتی پر بھی۔ اور اس بنا پر مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش حاکمانہ فراست کا کوئی اچھا مظاہرہ ثابت نہیں ہوگی۔ تاریخ گواہ ہے کہ سرسیدؒ کا یہ تیر نشانے پر بیٹھا اور برطانوی حکومت کے زعماء نے مسلمانوں کے خلاف اپنے نقطۂ نظر اور پالیسی کو تبدیل کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اندازہ لگائیے کہ اگر سرسیدؒ کی یہ مصلحت کوشی اور دوربینی اس نازک وقت پر آڑے نہ آتی تو آج اس ملک کا نقشہ کیا ہوتا؟ اپنی اس حکمتِ عملی سے سرسید نے نہ صرف اپنی قوم کو موت کے چنگل سے نجات دلائی بلکہ اُس کے لئے ایک زندہ اور باوقار قوم کی راہیں بھی ہموار کیں۔

جہاں تقاضائے وقت کی مصلحتوں کی بنا پر سرسیدؒ نے یوں ہماری مسیحائی کی وہاں اس کی غیرت نے اسلام اور مسلمانوں کی عزت و ناموس کے معاملے میں کبھی اپنے اندر نہ تو لچک آنے دی اور نہ ہی مصلحت اور کمزوری کو اپنایا۔ ڈاکٹر ہنٹر برطانوی سلطنت کے ممتاز مدبر اور سرسیدؒ کے گہرے دوست تھے۔ انھوں نے جب "انڈین مسلمانز" نامی کتاب لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "مسلمان ازروئے ایمان سلطنت کے باغی ہیں" تو مسلمانوں کے لئے یہ بڑا ہی نازک اور کڑا وقت تھا۔ بنگال میں وہابی تحریک کا معاملہ ابھرا ہوا تھا اور وہاں کے انگریز چیف جسٹس مسٹر نارمن ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ لیکن تمام مصلحتوں کو ٹھکرا کر سرسیدؒ فوراً خم ٹھونک کر میدان میں نکلے اور ڈاکٹر ہنٹر کے الزامات کا وہ منہ توڑ جواب دیا کہ اُسے اور تو اور خود اپنی قوم کے ان لوگوں کی ملامتیں برداشت کرنی پڑیں جو سرسیدؒ کے ریویو سے پہلے اُس کی کتاب سے متاثر ہو کر مسلمانوں سے شدید طور پر بدظن ہو گئے تھے۔ سرسیدؒ کی اس جرأتِ نگارش نے ذہنوں سے گرد و غبار کو دھو ڈالا۔ اور برطانوی حکمران ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اپنی روش پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ڈاکٹر ہنٹر کے بعد سرسیدؒ کو سر ولیم میور سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ سر ولیم یہاں برطانوی حکومت کے بہت بڑے ستون تھے۔ ایک بے نے گورنر ــــــ اور اُس زمانہ کے گورنر! لیکن جب انھوں نے "لائف آف محمدؐ" کی چار جلدیں شائع کر کے اسلام اور حضور رسالتمآبؐ کی سیرتِ طیبہ پر گھناؤنی تنقید سے کام لیا تو سرسیدؒ کا جوشِ غضب دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا۔ ان کا دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ اور جب جواب لکھنے کے لئے یہاں سے ضروری مواد نہ ملا تو انگلستان پہنچے۔ وہاں کی لائبریریوں کی ورق گردانی کی۔ فرانس مصر اور دیگر ممالک سے کتابیں منگوائیں۔ اور دن رات کی مسلسل عرق ریزی اور جانفشانی سے اُس کا جواب "خطباتِ احمدیہ" کی صورت میں انگلستان

سے شائع کیا۔ اندازہ لگائیے اُس شخص کے کردار کی عظمت کا کہ جب بھی دینی غیرت کا کوئی تقاضا سامنے آیا وہ حکومت کے ہر بڑے سے بڑے ستون سے بے خوف و خطر ٹکرا گیا۔ اور اس راہ میں نہ کبھی ملازمت کا سوال سدِ راہ ہوا اور نہ کوئی دوسری مصلحت اور مفاد۔

انگریز اور اس کی حکومت کے معاملہ میں سرسید کی حق گوئی و بے باکی کا ایک اور شاہکار سرسید کی مشہور تصنیف "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" ہے۔ انگریز حکمرانوں کے دلوں میں ابھی ۱۸۵۷ء کی بغاوتِ ہند کے زخم بالکل تازہ تھے اور ہندوستانیوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف ان کے دلوں میں غیض و غضب کی آگ بے طرح بھڑک رہی تھی۔ مارشل لاء کا دور دورہ تھا۔ چوراہوں تک میں پھانسیاں نصب تھیں۔ سامراجی خوف و ہراس کی اس بھیانک فضا میں سرکاری ملازمت کے باوجود سرسیدؒ کے قلم میں حرکت پیدا ہوئی اور بلا خوف لومۃ لائم اُس نے مذکورہ رسالہ شائع کر کے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ حکمرانوں میں اس کتاب کی اشاعت سے جو غم و غصہ پیدا ہوا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اُس وقت کے فارن سکریٹری مسٹر سیسل بیڈن نے ایک دھواں دھار تقریر میں سرسید کی کتاب کو "باغیانہ مضمون" قرار دیا اور مطالبہ کیا کہ مصنف کو کڑی سزا دی جائے۔ لیکن سرسیدؒ نے حکمرانوں کی دھمکیوں کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی۔

برطانیہ کی ہیبتناک امپریلزم کے خلاف یہ "آئینِ جوانمرداں" بھی اگر سرسیدؒ کی انگریز پرستی کی دلیل ہے تو اس "انگریز پرستی" پر بڑی سے بڑی حریت پرستی کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہمارے عظیم المرتبت زعیم قوم کی عظمت کی چند جھلکیاں ہیں۔ اُس کی یہ عظمت، قیادت کے لاتعداد گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کا وہ گوشہ جو مستحقِ تحسین و تبریک ہے، دارالعلوم علی گڈھ کی تعمیر ہی کو سامنے لائیے۔ کتنا بڑا کارنامہ ہے جو اس کے عزم بلند اور جوشِ کردار سے حاصلِ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے لئے اسے کس قدر جان توڑ جدوجہد، بے پناہ تگ و تاز اور بے مثال جانفشانی سے کام لینا پڑا اُس کا صحیح اندازہ شاید ہم آج نہ لگا سکیں۔ اس سعیِ مسلسل کے دوران میں اُس کے پیشِ نظر کیا مقصدِ عظیم تھا یہ جاننے کے لئے ہمارے ایک نامور مفکر اور ادیب صلاح الدین احمد کے ان الفاظ کو سامنے لائیے۔

> وہ علی گڈھ کو مسلم لیڈر شپ کے لئے ایک زندہ و پائندہ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ سرسیدؒ کی دوربینی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کام وہ اپنی زندگی میں شروع کر جائیں گے اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور محیط کل ہو جانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پروگراموں کی بجائے وہ پروگرام بنانے والے پیدا کریں جو اپنے اپنے حالات کے مطابق اس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں جو انھوں نے ملتِ اسلامیہ ہند کی فلاحِ عام کے لئے تیار کیا تھا..... چنانچہ علی گڈھ کو انھوں نے اس نمونے پر تیار کیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی وحدتِ خیال کا مرکز بن گیا اور بیداری و رہبری کی جو لہریں یہاں سے منتشر ہوئیں وہ برعظیم ہند کے ہر گوشے میں پہونچ کر اثر آفریں ثابت ہوئیں۔ (مقالہ۔ سرسید احمد خاں پر ایک نظر)

دارالعلوم علی گڈھ قومی نشوونما کا اس قدر عظیم اور مرکزی شاہکار تھا کہ ایک ایرانی نکتہ رس نے جب اسے دیکھا تو بے ساختہ کہا "جو کام حکومت کی طاقت سے باہر تھا اسے ایک تنہا انسان نے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا" اس دارالعلوم کے صدقے میں ہمارا قومی خزانہ کیسے کیسے

گہرہائے آبدار سے مالا مال ہوا۔ اس کا جواب تاریخ کے مؤرخ سے پوچھئے۔ علی گڈھ نے طلب علم کی جو آرزوئیں اور امنگیں اسلامیانِ ہند کے دلوں میں پیدا کیں۔ انھوں نے پوری قوم کا رُخ بے راہ روی اور جہالت پسندی سے حصولِ علم کی طرف پھیر دیا اور ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اگر سرسید کا یہ شاہکار سامنے نہ آتا تو اس ملک کی فضاؤں میں نہ محمد علی جوہر اور ظفر علی کے نعرہ ہائے حریت سنائی دیتے۔ نہ اقبالؒ کے حیات آفریں نغموں کی گونج فردوسِ گوش بنتی اور نہ وہ قائدِ اعظم میدانِ قیادت میں نظر آتا جس کا مدبّر برطانوی سامراج اور ہندو راج کے لئے ملک الموت ثابت ہوا اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم مملکت کا اسلامی معمار۔

میدانِ عمل کی ان کارفرمائیوں سے ہٹ کر سرسیدؒ کے خلوصِ فکر و نظر کی معجز نمائیوں کی طرف آیئے تو یہاں بھی قدم قدم پر سرِ راہ وہ روشن چراغ نگاہوں کے سامنے آئیں گے جو اس منزل پر آگے بڑھنے والوں کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں بھی وہ ان سب کا راہ نما دکھائی دے گا جو اپنے دلوں میں ذوقِ سفر کی تڑپ رکھتے ہیں اور ماضی کے سرمائے پر تکیہ کر کے وقت کے تقاضوں کے سامنے سپر انداز ہونا قبول نہیں کرتے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے افکارِ تازہ کی متاعِ بے بہا چھوڑ جاتے ہیں۔

تحریر و تقریر اور علمی و فکری تحقیقات کے میدان میں بھی سرسید کی تالیف و تصنیف کا سلسلہ کافی وسعت رکھتا ہے۔ جہاں انکی تقریر و خطابت۔ خراجِ تحسین وصول کیا وہاں اس نے اپنی گرانمایہ تصانیف کا بہت بڑا سلسلہ بھی قوم کے علمی سرمایہ میں شامل کیا۔ دیگر اہم تصانیف سے قطع نظر ہم ان کی تفسیر القرآن کی طرف آتے ہیں۔ ان کے مکتبِ فکر کے مخالفین اس تفسیر کو نشانۂ تنقید بنا سکتے ہیں اور آج کے نئے ارتقائی لیٹ فارموں سے یہ دعویٰ بھی بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ فلاں مقام پر انھوں نے اجتہادی ٹھوکر کھائی۔ اور فلاں معاملہ میں ان کی قرآنی فکر اور دینی تفقہ میں غلطی کا امکان ہے۔ لیکن ہو چکے کہ ایک نبی کے علاوہ دوسرا کون ہے جس کی ہر بات کو حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے اور پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ دین کے معاملہ میں مسلکِ تقلید کو ٹھکرا کر تفقہ فی الدین کا پہلا علمبردار سرسید ہی تو تھا۔ اسی نے مدتوں کے بعد اس باب کا از سرِ نو افتتاح کرنے کی جرأت کی اور پھر ثابت کیا کہ ایمان وہی ہے جو علیٰ وجہ البصیرت پیدا ہو۔ آج جبکہ دین کے معاملہ میں فکری اصلاح و ارتقاء کے لحاظ سے ہم ایک صدی آگے بڑھ آئے ہیں سرسیدؒ کے سرمائے میں شاید کوئی تنوع اور ندرت نظر نہ آئے بلکہ اس میں کئی مقامات پر غلطیاں بھی دکھائی دے سکتی ہیں۔ لیکن یہ بھی تو اندازہ لگائیے کہ ایک صدی قبل ان قلمی کاوشوں کی قدر و قیمت کیا ہو گی۔ چراغ کی روشنی برقی قمقموں کی موجودگی میں دلکشی پیدا نہیں کرتی۔ لیکن مدتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں یہ چراغ کتنا انمول دکھائی دے گا۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے کہ سرسید نے یہ چراغ اُس وقت روشن کیا جب اندھیروں میں بھٹکتے مسافر روشنی کی ایک کرن تک کو ترس گئے تھے۔ سرسیدؒ پہلا شخص تھا جس نے اس حقیقت کو کماحقہٗ محسوس کیا۔ صدیوں کے طویل دورِ ملوکیت میں عالمِ اسلام کی فکری صلاحیتوں پر جو مسلسل پہرے بٹھائے گئے تھے اور اس میں مفاد پرستیوں کے تحت جو کچھ مذہبی رنگ پیدا کیا گیا تھا وہ جزو دین اور بالآخر عین دین بن گیا۔ اور پھر یہ ناممکن ہو کر رہ گیا کہ اصل اسلام کی عالم آرا اقدار ابھر کر سامنے آسکیں۔ یہ بڑا ہی نازک مرحلہ تھا اور یہاں ادنیٰ سی جرأت بھی بدترین مخالفتوں اور تکفیر کے فتووں کا شکار ہو سکتی تھی۔ لیکن سرسیدؒ یہاں بھی سب کے بالمقابل سینہ سپر ہو گیا۔ اور قرآن کریم کی روشنی میں مذہبی اجارہ داروں کے خود ساختہ مذہب کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ یہ موقع نہیں کہ ہم سرسید

کی تفسیر القرآن یا دیگر دینی افکار پر بحث کریں اور نہ ہی ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں (خود سرسید نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہر ایک کو اپنی فکری تقلید سے بشدت روکا) کہ ان کی فکر کو دین کے معاملے میں حرفِ آخر یا غلطیوں سے مبرا قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تو پورے دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی جرأتِ مردانہ نے ہمارے لئے غلط اور صحیح کو پرکھنے کی راہ کھول دی اور اس طرح ہمارے اس حق کو بحال کیا جو خدا کا دین ہر مومن کو عطا کرتا ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ تفسیر القرآن لکھ کر سرسید نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ مذہبی اجارہ دار جن کی باہمی فرقہ بازیوں کی آگ صدیوں سے خرمنِ ملت کو جلاتی چلی آ رہی ہے اور آج تک کبھی دھیمی نہیں پڑی۔ سب کے سب ایک متحدہ محاذ بنا کر "ایک سرسید کے خلاف میدان میں آ نکلے اور ملک کے طول و عرض میں طوفان برپا کر دیا۔ تکفیر کے ترکش کا ہر تیر اپنے ارمان پورے کرنے کے لئے حرکت میں آیا۔ قتل کی دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپنے ساتھ چھوڑ کر بے گانے ہو گئے۔ "خود ساختہ جانشینانِ رسول" نے اسے اپنے فتووں میں "شیطان" اور "ابلیسِ لعین" کہہ کہہ کر "خلقِ عظیم" کا ثبوت دیا۔ لیکن عزم و استقلال کا یہ پہاڑ اپنے مقام پر جما رہا۔ اس عالم میں بھی اس کے ولولوں اور مسکراہٹوں کی شان بدستور قائم تھی۔ وہ ایسے دل گردے کا انسان تھا اور اپنی ملت کا درد اس کے قلب و دماغ پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ تکفیر اور گالی گلوچ کے اُن "کارناموں" کے دوران ہی جب وہ لاہور آیا تو ایک اجتماعِ عظیم میں تقریر کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

> اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اُسے اپنا خادم اور خیر خواہ نہیں سمجھیں گے؟ آپ کے لئے دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں یا آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چمار، قلی، کافر، بت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھے بھی اس مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی اور چمار کی مانند تصور کر لیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔ (حیاتِ جاوید)

یہ تھا وہ سرسید جو بقول ایک بہت بڑے انگریز کے "اگر یورپ میں ہوتا تو وہاں کی کسی بہت بڑی سلطنت کا وزیر اعظم ہوتا"۔ لیکن سرسید تو ایک دم ٹوٹتی قوم کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے آیا تھا۔ اور واقعی اس کی یہ مساعی تاریخ کا ایک درخشندہ باب بن چکی ہے اور اُس کی عظمت کا فلک بوس مینار۔ اس کے گرد اگرد وہ رفیقِ کار جمع ہو گئے تھے۔ جن میں سے ایک ایک اپنی اپنی جگہ نمایاں حیثیت کا مالک تھا۔ محسن الملک، وقار الملک۔ مولانا حالی۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ یہی ایثار پیشہ زعیم تھا جو ہمیشہ ذاتی صلہ اور شہرت سے بے نیاز رہا۔ اور جب کبھی اُس سے اس کی سوانح حیات قلمبند کرنے کی گفتگو ہوئی تو اس نے ہمیشہ یہی کہا۔

> میری لائف میں اس کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے کہ لڑکپن میں خوب گیڈیاں کھیلیں۔ کنکوے لڑائے۔ کبوتر پالے۔ ناچ نجرے دیکھے۔ اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے۔ (حیاتِ جاوید)

لیکن سیدؒ کے اس انکسار سے اُس کی عظمت کم نہیں ہوجاتی بلکہ اس سے اس کی پُرخلوص زندگی کی ایک اور دلکش تصویر ہماری سامنے آجاتی ہے۔ اور اُس کی عظمت کردار کی کتنی ہی تصویریں ہیں جو ہماری نشاۃ ثانیہ کی تاریخ میں ایک ایک ورق پر جگمگا رہی ہیں۔ اُس کی عظمت کے اعتراف میں ہم اس مضمون کو انگلستان کی ایک شریف خاتون کے اُس مرثیہ پر ختم کرتے ہیں جو اُس نے اس زعیم ملت کی وفات پر سپرد قلم کیا تھا۔ اس مرثیہ کا اردو ترجمہ یں سنیئے:

"ایک تناور درخت جہاں کھڑا تھا وہیں گر پڑا۔ اس کی سایہ دار شاخیں جو چاروں طرف دور دور تک جھومتی تھیں۔ صحت بخش شبنم ان سے ٹپکتی تھی۔ انھوں نے کثرت سے بیج بکھیرے اور ان کے سائے میں بنجر زمین اصلاح پا گئی۔

بیج پھوٹ نکلے۔ شگفتہ و شاداب پھول کھلنے لگے اور خوبصورت پھولوں نے جو توانائی اور حسن سے آراستہ تھے اس ویران ریگستان کو گلزار بنا دیا۔ اب اشک بہاؤ اس شاہانہ درخت کے لئے کہ اجل نے اسے گرا دیا۔

غم کرو — لیکن امید کے ساتھ — کیونکہ وہ سرسبز و شاداب کھیتیاں جو اس کی عرق ریزیوں کا ثمر ہیں۔ اس کے مزار کے گرد لہلہا رہی ہیں۔ جن نونہالوں نے اُس کی آغوش میں نشو و نما پائی۔ وہ اب پھل پھول رہے ہیں۔ یہ نونہال بھی اُسی کی مانند زندہ رہینگے۔ تاکہ کسی نہ کسی ویرانہ کو گلزار بنا جائیں؟"　　(حیات جاوید)

حسرت آمیز!

آج سے چند برس اُدھر تک طلوع اسلام کی ہر اشاعت میں التزاماً ایک آدھ نظم شائع ہوا کرتی تھی۔ اور بالعموم یہ نظم ہوتی تھی جناب اسد ملتانی کی۔ اسد صاحب کا خمیر ملتان کی حرارت بخش مٹی سے اٹھا۔ انھوں نے لاہور کی اُس بصیرت افروز فضا میں تعلیم پائی جس میں فکر اقبال کی نکہت دلنواز عطر پاش تھی۔ ملازمت کے سلسلہ میں انھوں نے زندگی کا بیشتر حصہ دہلی اور شملہ میں بسر کیا۔ تشکیل پاکستان کے بعد کراچی آگئے۔ اور وہاں سے گذشتہ اکتوبر میں دفاتر کے ساتھ راولپنڈی تشریف لے گئے۔ وہاں سے ابھی ابھی (۱۸ $\frac{11}{59}$) ایک دوست نے ٹیلی فون پر اطلاع دی ہے کہ حرکت قلب بند ہوجانے سے گذشتہ شب ان کا انتقال ہوگیا۔ اس اچانک خبر سے بڑا صدمہ ہوا۔

اسد صاحب کو علامہ اقبالؒ سے قلبی تعلق تھا اور اسی وجہ سے طلوع اسلام سے انھیں والہانہ دلبستگی رہی۔ (کچھ عرصہ سے انھیں بعض امور میں اس سے اختلاف ہوگیا تھا لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے دوستانہ تعلقات میں کوئی فرق نہیں آنے دیا) اسلام کی محبت ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست تھی اور ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کا خیال ان کی زندگی کا جزو۔ تحریک پاکستان کے ساتھ ان کی شیفتگی کا یہی جذبہ محرکہ تھا۔ اور یہی وہ جذبات تھے جو شعر بن کر ان کے لب تک آجاتے تھے۔ وہ بڑی محبت کے انسان تھے۔ ان کے اُٹھ جانے سے دوستوں کی محفل سونی ہوگئی۔ ہمیں اس صدمہ میں ان کے برادران عزیز محمد اکرم خاں اور محمد اسلم خاں صاحب سے دلی ہمدردی ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اور ان کے پسماندگان کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

بیادِ (علامہ) اسلم (جیراجپوریؒ)

دسمبر ۱۹۵۵ء میں علامہ اسلم جیراجپوری (علیہ الرحمۃ) کا انتقال ہوا تھا۔ اس واقعہ کو چار برس ہو گئے لیکن ذہنوں میں ان کی یاد کا یہ عالم ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے گویا

وہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، وہ آ رہے ہیں، وہ جا رہے ہیں

حقیقت یہ ہے کہ جو لوگ اپنے کارناموں سے قرطاسِ زمانہ پر اپنا نقشِ دوام ثبت کر جاتے ہیں ان کی کیفیت یہی ہوتی ہے کہ ـــــ وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں ـــــ علامہ مرحوم نے فکرِ قرآنی کی جو شمع روشن کی تھی اس کی روشنی ان کی طبیعی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو سکتی تھی، نہ ہوئی۔ وہ برابر پھیلتی اور آگے بڑھتی چلی جاتی ہے، اور چلی جائے گی۔ محفلِ طلوعِ اسلام میں قرآنی بصیرت کی جو مختلف قندیلیں جگمگا رہی ہیں۔ ان میں علامہ مرحوم کی شمعِ قرآنی کی حیثیت بڑی نمایاں ہے۔

علامہ مرحوم کی یاد تازہ کرنے کے لئے ہم ذیل میں آپ کا وہ مقالہ درج کرتے ہیں جو طلوعِ اسلام کے پہلے شمارہ (بابت مئی ۱۹۳۸ء) میں شائع ہوا تھا۔ آپ دیکھیں گے کہ اس اکیس بائیس برس کے عرصہ میں اس گلِ نوبہار کی تروتازگی اور شگفتگی و شادابی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قرآن کا سحابِ کرم انسانی فکر کو اس طرح ثبات و دوام عطا کر دیتا ہے۔ کس قدر خوش بخت ہیں وہ لوگ جنھیں ایسی گراں بہا نعمت نصیب ہو جائے۔ رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ ذالک الفوز العظیم۔

فہمِ قرآن

(علامہ اسلم جیراجپوریؒ)

قرآن کریم مکمل اور کامل کتاب ہے اور اس قدر واضح اور روشن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کا نام ہی "نورِ مبین" رکھا ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا (۴/۱۷۴)

اور ہم نے جگمگاتا نور تمہاری طرف اتارا

نور خود بھی روشن ہوتا ہے اور اردگرد کی چیزوں کو بھی روشن کر دیتا ہے۔ یہی حال قرآن کا ہے کہ وہ واضح، کھلا ہوا اور روشن ہے اور اپنی تشریح آپ ہے۔ اس کی تلاش کے لئے کسی روشنی کی ضرورت نہیں جس طرح آفتاب کو چراغ سے نہیں ڈھونڈا جاتا۔ وہ دین و دنیا کے ان جملہ حقائق کی جن سے انسان کو ہدایت ملے اور قدیمی آسمانی کتابوں کی جملہ تعلیمات کی توضیح اور تفصیل اپنے اندر رکھتا ہے۔

وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (۱۶/۸۹)

اور ہم نے تجھ پر کتاب اتاری جو ہر شے کی تشریح اور مسلمانوں کے لئے ہدایت اور رحمت اور بشارت ہے

مَا كَانَ حَدِيْثًا يُّفْتَرٰى وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (۱۲/۱۱۱)

یہ قرآن کوئی بنائی ہوئی بات نہیں ہے بلکہ اس میں پہلی کتابوں کی تصدیق اور ہر شے کی تفصیل ہے اور ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں ہدایت اور رحمت ہے۔

مَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۰/۳۷)

یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی دوسرا اس کو بنالے بلکہ یہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے اور الکتاب کی تفصیل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں یہ رب العالمین کی طرف سے ہے۔

آیت بالا میں الکتاب سے مراد علم الٰہی ہے جس کو قرآن میں جابجا اسی لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّ ذٰلِكَ فِيْ كِتٰبٍ (۲۲/۷۰)

کیا تو نہیں جانتا کہ اللہ ان سب چیزوں کا علم رکھتا ہے جو آسمان و زمین میں ہیں بے شک وہ لکھی ہوئی ہیں۔

اس علم کو کتاب مبین فرمایا ہے۔

وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِيْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ (۶/۵۹)

وہ جانتا ہے جو کچھ خشکی اور تری میں ہے اور کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اس کا علم رکھتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ ہے اور جو کچھ خشک و تر ہے وہ سب کتاب مبین میں ہے۔

اسی کتاب مبین کو اللہ نے عربی قرآن بنایا۔

وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۴۳/۲)

اور کتاب مبین شہادت دیتی ہے کہ ہم نے اس کو عربی بنایا تاکہ تم سمجھ سکو۔

کتاب مبین صحیفۂ فطرت ہے جو فعلِ الٰہی ہے۔ اب صحیفۂ فطرت فعل الٰہی اور کتاب مبین علم الٰہی اور قرآن کریم قول الٰہی۔ ان تینوں کی حقیقت کا متحد ہونا واضح ہو گیا۔ جس طرح صحیفۂ فطرت کے حقائق کی وسعت بے پایاں ہے اسی طرح قرآنی حقائق کی بھی کوئی انتہا نہیں ہے اور انسانی نسلیں ان کو کبھی نہیں ختم کر سکتیں۔ اسی صلاحیت کی وجہ سے قرآن ہمیشہ کے لئے بنی نوع انسان کی ہدایت کا نصاب مقرر کیا گیا ہے۔

مزید توضیح کے لئے یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ مصنوعاتِ فطرت اور مصنوعاتِ انسانی میں اس قدر بدیہی فرق ہے کہ ہر انسان بلا کسی قسم کے ریب اور شک کے ان دونوں میں امتیاز کر لیتا ہے۔ مثلاً زمین، دریا، پہاڑ اور جنگل دیکھ کر سب کو یقین کے ساتھ علم ہو جاتا ہے کہ یہ فطری چیزیں ہیں۔ اور اگر زمین پر کوئی عمارت یا پہاڑیں کوئی بُت یا دریا میں کوئی کشتی یا جنگل میں کسی مشین کا ٹکڑا نظر آئے تو ہر شخص بلا اشتباہ کے سمجھ جاتا ہے کہ یہ انسانی ساخت ہے۔ درخت پر سے گرا ہوا ایک پتا۔ گھاس میں سے جھڑا ہوا ایک تنکا۔ چیونٹی کا ٹوٹا ہوا ایک پاؤں۔ بھیڑ کا گرا ہوا ایک بال۔ اگر سارے عالم کے ماہر کاریگر جمع ہو کر بھی بنانا چاہیں تو نہیں بنا سکتے۔ یہی فرق اللہ کے کلام اور انسانی اقوال میں ہے۔

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (۱۷/۸۸)

کہدے اگر سارے جن وانس اس بات پر متفق ہوں کہ قرآن جیسا کلام بنائیں تو بھی ویسا نہیں بنا سکتے اگرچہ ایک دوسرے کے مددگار کیوں نہ ہوں۔

لیکن معنوی حقائق چونکہ عقلی چیزیں ہیں۔ اس لئے یہ فرق سر کی آنکھوں سے نظر نہیں آتا بلکہ دل کی آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے اور یہی قرآن کا اعجاز ہے جو اہلِ بصیرت پر نمایاں ہے۔ جن لوگوں نے آیاتِ الٰہی کا موازنہ اقوالِ انسانی کے ساتھ کر کے اس کے اعجاز دکھانے کی کوشش کی ہے۔ وہ حقیقت میں اعجازِ قرآن کے سمجھنے سے بہت دور تھے۔

دوسرا فرق مصنوعاتِ فطرت اور مصنوعاتِ انسانی میں یہ ہے کہ فطری اشیاء کے منافع اور تاثیرات کی کوئی معین حد نہیں ہوتی بلکہ ان کے متعلق جس قدر معلومات بڑھتی جاتی ہیں اسی قدر ان کے افعال و خواص معلوم ہوتے جاتے ہیں۔ بخلاف انسانی مصنوعات کے کہ ان کی غرض و غایت متعین ہوتی ہے اور ان سے وہی نفع لیا جاتا ہے جن کو پہلے سے مدنظر رکھ کر وہ بنائی جاتی ہیں۔ یہی کیفیت خالق اور مخلوق کے کلام کے مراتب کی ہے۔ قرآن اللہ کا کلام ہے۔ وہ کسی ایک ماحول، ایک زبان یا ایک مکان کے لئے نہیں ہے بلکہ ہر ماحول، ہر زمان اور ہر مکان میں انسان کا اشیائے فطرت کے متعلق جس قدر علم بڑھتا جائے گا۔ اسی قدر قرآنی حقائق بھی اس کی سمجھ میں آتے جائینگے۔ اور قرآن بھی فطری اشیاء کی طرح کسی زمانہ میں ختم ہو جانے والا اور تھکنے والا نہیں ہے۔ بخلاف انسانی اقوال کے کہ ان کے معانی محدود ہوتے ہیں۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عہدِ صحابہ میں قرآن بالکل سمجھ لیا گیا اور اب ہم کو انہیں کی فہم پر قناعت کرنا چاہیئے ــــ وہ قرآن کی حقیقت سے

آشنا نہیں ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کا علم قرآن دیگر علماء قرآن سے اس لحاظ سے افضل ہے کہ انھوں نے اس کے عملی پہلو کو اختیار کیا اور جو کچھ سمجھایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سمجھایا اس کی حرف بحرف تعمیل کی۔ اور حقیقت یہ ہے کہ قرآن صرف نظری کتاب نہیں ہے بلکہ عملی بھی ہے اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے سے ہی فلاح نصیب ہوتی ہے۔ اس لئے صحابہؓ کا درجہ عملی لحاظ سے اس قدر افضل ہے کہ ساری امت مل کر بھی ان کے رتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ لیکن جو لوگ فہم قرآن کو ان روایات میں الجھانا چاہتے ہیں جو صحابہ کرامؓ سے مروی ہیں وہ اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ قرآن کسی ایک ماحول کی کتاب نہیں ہے۔ اگر کسی زمانہ میں وہ بالکل سمجھ لیا گیا تو بس ختم ہو گیا اور آئندہ کے لئے نصاب نہیں رہا۔ لیکن وہ قیامت تک کے لئے نصاب ہے۔ اور ہر زمانہ میں نئی روشنی ہدایت کے لئے اس سے نکالی جا سکتی ہے۔ علاوہ بریں یہ روایات جن ذرائع سے آئی ہیں وہ اس قدر غیر یقینی اور مشتبہ ہیں کہ ان پر قرآن جیسی قطعی اور یقینی چیز کا مدار رکھنا اس کی قطعیت کو کھونا ہے۔

یہ خیال بھی کہ اس زمانہ میں جب آیات نازل ہوتی تھیں لوگ ان کے شانِ نزول سے واقف تھے۔ اس لئے انھوں نے اچھی طرح ان کو سمجھ لیا۔ دراصل قرآن کے متعلق اسی غلط تصور کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک ہی زمانہ کی چیز ہے۔ قرآن کسی شانِ نزول، موقع نزول یا واقعہ نزول کا پابند نہیں ہے۔ اور اس کی ہدایات مخصوص زمان و مکان سے وابستہ نہیں ہیں۔ بلکہ بالاتر ہیں۔

ہماری تمام تفسیریں آغاز عہد سے اب تک یعنی امام ابن جریر طبری سے مفتی محمد عبدہٗ تک اسی قدامت پرستی کے نظریے کے ماتحت لکھی گئی ہیں اور ان کا انداز بھی شروع سے آج تک ایک ہی ہے۔ یعنی وہ سلسلہ بسلسلہ آیات کے ساتھ چلتی ہیں۔ اس طرح آیات اور الفاظ کی تو ضرور تشریح ہو جاتی ہے مگر قرآنی مسائل اور حقائق سمجھ میں نہیں آتے۔ کیونکہ وہ مسلسل نہیں بیان کئے گئے ہیں بلکہ مختلف صورتوں اور آیتوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس لئے قرآن فہمی کے لئے یہ تفسیریں زیادہ کارآمد نہیں ہیں۔ ان تمام تفسیروں کا جو مفید حصہ ہو سکتا ہے وہ تقریباً اسی قدر ہے جس کو راغب اصفہانی نے اپنی کتاب مفردات میں جمع کر دیا ہے۔ بقیہ جو کچھ ہے وہ سلف کی آیات فہمی کی تاریخ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم اپنی شرح آپ ہے۔ اس کی تفسیر اللہ نے اپنے ذمہ لی ہے۔

ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (۱۹/۷۵)

پھر اس کی تشریح بھی ہمارے ذمہ ہے

آیاتِ قرآنی بیشتر محکم ہیں۔ یعنی ان کے معنی قطعی اور متعین ہیں۔ تھوڑی سی متشابہات ہیں جن کے حقائق انسان کی علمی دسترس سے بالاتر ہیں۔ مثلاً اللہ کی ذات۔ صفات۔ جنت۔ دوزخ اور میزانِ عمل وغیرہ جن کو تمثیل اور تشبیہ کے طور پر قرآن نے بیان کیا ہے اور جن کی اصل حقیقت سمجھنے سے انسان اس دنیا میں قاصر ہے۔

محکم آیات جو ام الکتاب اور اصل قرآن کہی گئی ہیں۔ ان کی تفصیلات اللہ ہی کی طرف سے کی گئی ہیں۔

كِتَابٌ أُحْكِمَتْ آيَاتُهُ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِن لَّدُنْ حَكِيمٍ خَبِيرٍ (۱/۱۱)

(یہ مکمل) کتاب ہے جس کی آیتیں محکم بنائی گئی ہیں۔ پھر حکمت اور خبر رکھنے والے اللہ کی طرف

سے ان کی تفصیل کی گئی ہے۔

یہ تفصیل علم کے ساتھ کی گئی ہے۔

وَلَقَدْ جِئْنَاهُمْ بِكِتَابٍ فَصَّلْنَاهُ عَلَىٰ عِلْمٍ (۷/۵۲)

ہم ان کے پاس ایسی کتاب لائے ہیں جن کی تفصیل ہم نے علم کے ساتھ کی ہے۔

اسی لئے قرآن کو کتاب مفصل کہا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا (۶/۱۱۴)

اور وہی اللہ ہے جس نے تمہاری طرف کتاب اتاری تفصیل شدہ۔

یہ تفصیل اہل علم اور اہل فہم کے لئے ہے۔

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۱۰/۵)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو علم رکھتے ہیں

قَدْ فَصَّلْنَا الْآيَاتِ لِقَوْمٍ يَفْقَهُونَ (۶/۹۸)

ہم نے آیات کی تفصیل ان لوگوں کے لئے کی ہے جو فہم رکھتے ہیں۔

جس قدر انسان کا علم حقائق فطرت کے متعلق بڑھتا جائے گا اسی قدر وہ قرآنی تعلیمات زیادہ سمجھنے کے قابل ہوگا۔ اگر معانی سمجھنے میں اختلافات واقع ہوں تو قرآن ان کو رفع کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔ جس طرح کہ اشیاء فطرت کے محققین میں کبھی کبھی نظریوں کا اختلاف واقع ہو جاتا ہے لیکن مزید غور و فکر سے رفتہ رفتہ آخر کار وہ مٹ جاتا ہے اور سب کے سب ایک حقیقت پر پہنچ کر متحد الخیال ہو جاتے ہیں۔

قرآنی آیات جو اکثر بہ تبدیل الفاظ و عبارات جا بجا الٹ پھیر کر بیان کی گئی ہیں۔ ان میں ان کی تشریح مضمر ہے۔

وَكَذَٰلِكَ نُصَرِّفُ الْآيَاتِ وَلِيَقُولُوا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهُ لِقَوْمٍ يَعْلَمُونَ (۶/۱۰۵)

اور اس طرح ہم آیتوں کو ہیر پھیر کر لاتے ہیں تاکہ وہ کہدیں کہ تو نے پڑھ کر سنا دیا اور تاکہ ہم اہل علم کے لئے اس (قرآن) کی تشریح کر دیں۔

الغرض قرآن کریم ایسی جامع اور کامل کتاب ہے کہ اس کی آیات۔ الفاظ اور تعلیمات کی تشریح و توضیح اور تفصیل سب اس کے اندر ہے اور سمجھنے کے قواعد اور ضوابط بھی بسط کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔

ادارہ طلوع اسلام کا لٹریچر اور لاہور سے ہر قسم کی اعلیٰ اور معیاری کتابوں کے لئے
مکتبہ طلوع اسلام - ۲۷۔ بی۔ شاہ عالم مارکیٹ۔ لاہور کو ایک کارڈ لکھ بھیجئے

آپ کتابوں کیلئے پریشان نہ ہوں

آپ کی سہولت کی غرض سے مکتبہ طلوعِ اسلام نے یہ انتظام کیا ہے کہ :۔

(۱) آپ کو کسی مصنف یا کسی پبلشر کی کتاب کی ضرورت ہو آپ ایک کارڈ مکتبہ کو لکھد یجئے۔ کتاب اصل قیمت پر آپ کو گھر بیٹھے مِل جائے گی (خرچ ڈاک بہر حال آپ کو ادا کرنا ہوگا)۔

(۲) ادارہ طلوع اسلام کا تمام لٹریچر مکتبہ سے مِل جائے گا۔ (اس کے لئے ادارہ کو نہیں بلکہ مکتبہ کو لکھیے)

(۳) اگر آپ "پیشگی خریدار" ہیں تو آپ کو ادارہ کا لٹریچر یا کوئی اور کتاب جسے آپ طلب کریں، بلا محصول ڈاک پہنچ جائے گی پہلے یہ صورت تھی کہ جب تک پیشگی خریدار کا ایک سَو روپیہ موصول نہیں ہو جاتا تھا، محصولڈاک بذمہ خریدار ہوتا تھا۔ اب یہ قاعدہ بدل دیا گیا ہے۔ اب جس وقت آپ پہلی قسط بھیج کر خریدار بنیں گے اُسی وقت سے آپ کو محصول ڈاک کی رعایت دیدی جائے گی۔ یعنی محصول ڈاک مکتبہ ادا کرے گا۔

اگر آپ "پیشگی خریداروں" کی لسٹ میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو مکتبہ کو ایک خط لکھ کر تفصیل معلوم کرلیں۔

(۴) طلوع اسلام کی بزموں کو دس فیصد کمیشن بھی دیا جائے گا اور محصولڈاک بھی مکتبہ خود ادا کریگا۔ (یہی رعایت لائبریریوں کو بھی دی جائے گی) البتہ ادارہ کی طرف سے شائع شدہ پمفلٹس پر یہ رعایت نہیں ہوگی۔

(۵) مکتبہ طلوع اسلام سے آپ کا تعاون، ادارہ طلوع اسلام سے آپ کا تعاون ہوگا۔ اس تعاون میں بخل یا سہل انگاری نہ فرمائیے۔ شکریہ۔

منیجر مکتبہ طلوعِ اسلام

(۲۷۔ بی) شاہ عالم مارکیٹ، لاہور

نقد و نظر

تقسیم ہند

مصنف۔ محترم عبدالوحید خاں۔ شائع کردہ۔ مکتبۂ ایوانِ ادب۔ ۱۵ کوپر روڈ لاہور۔ ضخامت (۲۰×۳۰/۱۶) ۳۹۰ قیمت، مجلد چھ روپے۔

جب تحریک پاکستان کی تاریخ لکھی جائے گی تو لکھنؤ کے، محترم عبدالوحید خاں صاحب کا نام اُس فہرست میں شامل ہوگا جو نمایاں حروف میں مرتب ہوگی۔ نظریۂ پاکستان کے پختہ حامی۔ اسلامک آئیڈیالوجی پر یقین محکم۔ ذہن میں جلا۔ دل میں سوز۔ پختہ فکر۔ شستہ قلم۔ انداز میں متانت۔ تحریر ہو یا تقریر، مستند واقعات اور محکم دلائل پر مبنی۔ ان کی دو کتابیں ــــ "مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ"۔ اور "تاریخ اکا دسیاسیات اسلامی"۔ اُسی زمانے میں ارباب ذوق سے خراجِ تحسین وصول کر چکی تھیں۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد آپ مجلسِ آئین ساز کے ممبر رہے لیکن سلسلہ تالیف و تصنیف کا رہا۔ خدشہ تھا کہیں یہ چنگاری، نامساعدتِ حالات کی راکھ کے نیچے دب کر بجھ ہی نہ جائے۔ بارے غنیمت ہوا کہ (مولانا) ابوالکلام آزاد (مرحوم) کی کتاب "انڈیا ونس فریڈم" کے جھکڑ نے اس راکھ کو اڑا دیا اور وہ چنگاری "تقسیم ہند" کی کتابی شکل میں ابھر کر سامنے آگئی۔

(مولانا) آزاد (مرحوم) کی مذکورہ بالا کتاب پر طلوع اسلام کی اشاعت بابت جولائی ۱۹۵۹ء میں تبصرہ شائع ہو چکا ہے۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ مولانا مرحوم نے کس طرح واقعات کو مسخ کر کے پیش کیا ہے اور اسلام کے خلاف کس قدر زہر افشانی کی ہے۔ ضرورت تھی کہ اس کتاب کا مفصل جواب لکھا جائے۔ محترم عبدالوحید خاں صاحب کی زیرِ تبصرہ کتاب اس ضرورت کو ایک حد تک پورا کرتی ہے۔ "ایک حد تک" اسلئے کہ مولانا مرحوم کی کتاب کے کئی گوشے ابھی ایسے ہیں جن پر مزید تفصیل سے لکھنے کی ضرورت ہے لیکن عبدالوحید خاں صاحب نے جو کچھ لکھا ہے خوب لکھا ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مولانا نے اپنی کتاب میں خود اپنے متعلق واقعات بیان کرنے میں کس قدر غلط بیانی اور تضاد سے کام لیا ہے، سیاسی احوال و کوائف کی کس طرح قطع و برید کی ہے اور تاریخ کو کس طرح مسخ صورت میں پیش کیا ہے۔ چونکہ عبدالوحید خاں صاحب خود اس جنگ آزادی میں شریک تھے جس کی داستان مولانا نے غلط رنگ میں پیش کی ہے اس لئے وہ حقیقی واقعات کی نقاب کشائی "قلندر ہرچہ گوید دیدہ گوید" کے انداز سے کرتے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں پورے حتم و یقین اور وثوق و اعتماد سے کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے "تقسیم ہند" ہماری جنگِ آزادی کے حقیقی پس منظر اور اس کے اہم واقعات کی رو میں سمجھئے کہ جزئی تاریخ بن گئی ہے۔ کتاب دلچسپ اس قدر ہے کہ ایک بار شروع کر دی جائے تو ختم کئے بغیر چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ ہم محترم مصنف کی خدمت میں ان کی اس کاوش پر ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور امید کرتے ہیں کہ انہوں نے "حصولِ پاکستان" کی مفصل تاریخ لکھنے کا جو وعدہ کیا ہے اس کے وفا ہونے میں غیر معمولی تاخیر نہیں ہوگی۔

"تقسیم ہند" مکتبۂ طلوع اسلام (۲۷۔ بی) شاہ عالم مارکیٹ لاہور سے بھی مل سکتی ہے۔

مجلسِ اقبال

خلاصۂ مطالبِ مثنوی ——— در تفسیر سورۂ اخلاص

(مسلسل)

(سابقہ قسط میں جو اکتوبر ۱۹۵۹ء کے طلوع اسلام میں شائع ہوئی تھی، سورۂ اخلاص کی تفسیر بیان ہو رہی تھی۔ اس تفسیر کا آخری حصہ حسب ذیل ہے۔ اس کے بعد "خاتمۃ الکتاب" ہے جسے اس تفسیر کے ساتھ مسلسل پیش کیا جا رہا ہے۔ اس قسط کے ساتھ مثنوی اسرار و رموز کی شرح کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی ہے کہ قارئین طلوع اسلام نے اس شرح کو بے حد پسند کیا ہے۔ ان کے مبرم تقاضوں کے پیش نظر ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ اسے الگ کتابی شکل میں بھی شائع کر دیا جائے۔ تاکہ یہ چار پانچ برس پر پھیلا ہوا سلسلہ یکجا سامنے آجائے۔ واللہ المستعان۔)

سورۂ اخلاص کی چوتھی آیت ہے۔

وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝

یہ ذاتِ خداوندی کے بے ہمتا ہونے کی شہادت ہے۔ اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کہتے ہیں۔

مسلم چشم از جہاں بر بستہ چیست؟
نطرتِ ایں دل بحق پیوستہ چیست؟

مومن کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ساری دنیا سے صرفِ نظر کر کے اپنی تمام توجہات کو قوانینِ خداوندی کی اطاعت پر مرکوز کر دیتا ہے۔ اس مومن کی مثال یوں سمجھئے گویا۔

لالۂ کوہسار کوہے دمید — گوشۂ دامانِ گلچینے ندید
آتشِ او شعلۂ گیرد بہ بر — از نفس ہائے نخستینِ سحر
آسماں ز آغوشِ خود نگذاردش — کوکبِ واماندۂ پنداردش

بوسدش اوّل شعاعِ آفتاب
شبنم از چشمش بشوید گردِ خواب

پہاڑ کی بلند ترین چوٹی پر لالہ کا ایک پھول کھلا ہے۔ اس تک کسی گلچیں کا ہاتھ نہیں پہونچ سکتا۔ صبح کی پاکیزہ ہوا اس کی پرورش کرتی ہے۔ آسمان اسے اپنی آغوش سے جدا کرنا نہیں چاہتا۔ سورج کی پہلی کرنیں اس کا منہ چومتی ہیں۔ شبنم اپنی زمزم باریوں سے اس کی آنکھوں سے نیند کی گردھاف کرتی ہے۔ یہ کیفیت ہوتی ہے ایک مردِ مومن کی جو ساری دنیا سے بلند ہو کر ایک خدا کی چوکھٹ پر جھکتا ہے۔

رشتۂ با "لم یکن" باید قوی
تا تو در اقوام بے ہمتا شوی

تجھے چاہیئے کہ خدائے بے ہمتا کے ساتھ اپنا تعلق مستحکم سے مستحکم تر کرتا چلا جائے تاکہ تو دنیا کی قوموں میں بے ہمتا ہو جائے۔

آنکہ ذاتش واحد است و لاشریک
بندہ اش ہم در نسازد با شریک

جس خدا کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس خدا کے بندے بھی (دیگر انسانوں کے مقابلہ میں) واحد و لاشریک ہوتے ہیں۔ ان کی برابری کوئی نہیں کر سکتا۔

مومنِ بالائے ہر بالا ترے
غیرتِ او بر نتابد ہمسرے

دنیا میں کوئی انسان کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو، مومن کا مقام اس سے بھی اونچا ہوتا ہے۔ مومن کی غیرت گوارا ہی نہیں کر سکتی کہ کوئی اور انسان اس کا ہم دوش ہو جائے۔

خرقۂ "لاتحزنوا" اندر برش
"انتم الاعلون" تاجے بر سرش

جماعتِ مومنین کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ ولا تھنوا ولا تحزنوا۔ وانتم الاعلون۔ ان کنتم مومنین۔ تم اگر مومن ہو تو سب پر غالب رہو گے۔ اس لئے تمہیں نہ کسی سے دبنے کی ضرورت ہے نہ افسردہ خاطر ہونے کی۔ مومن کی تو شان یہ ہے کہ

می کشد بارِ دو عالم دوشِ او
بحر و بر پروردۂ آغوشِ او

وہ دنیا اور آخرت دونوں جہانوں کی ذمہ داریاں اٹھاتا ہے اور انھیں نہایت خوش اسلوبی سے پورا کرتا ہے۔ خشکی اور تری سب اس کی آغوش میں پرورش پاتی ہیں۔ وہ ساری دنیا کی ربوبیت کا ذمہ لیتا ہے۔

برغوِ تندر مدام افگندہ گوشش
برق اگر ریزد ہمی گیرد بدوشش

وہ کائناتی قوتوں کو مسخر کرتا ہے۔ ان سے ٹکر لیتا اور ان پر غلبہ پاتا ہے۔

پیش باطل تیغ و پیشِ حق سپر
امر و نہیِ او عیارِ خیر و شر

وہ باطل کے مقابلہ میں شمشیرِ خارہ شگاف کی حیثیت رکھتا ہے اور حق کی مدافعت میں سپر بن جاتا ہے۔ اگر یہ معلوم کرنا ہو کہ خیر کیا ہے اور شر کیا، تو دیکھنا یہ چاہیئے کہ مردِ مومن کس بات کا حکم دیتا ہے اور کس سے روکتا ہے۔ جس بات کا وہ حکم دے وہ خیر ہے جس سے روکے وہ شر ہے۔

در گرہ صد شعلہ دارد اخگرش
زندگی گیرد کمال از جوہرش

اس کی ذات میں مضمر صلاحیتوں اور ممکناتِ زندگی کی ایک دنیا پوشیدہ ہوتی ہے جن کی نشوونما سے حیات اپنی تکمیل تک پہنچتی ہے۔

در فضائے ایں جہانِ ہائے و ہو
نغمہ پیدا نیست جز تکبیرِ او

اس جہانِ خاموش کی فضا میں مردِ مومن کی تکبیر سے ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے۔ اگر اس کی بانگِ اذاں نغمہ بار نہ ہوتی تو فضائے کائنات حرکت سے محروم ہو جاتی۔

عفو و عدل و بذل و احسانش عظیم — ہم بقہر اندر مزاجِ او کریم
سازِ او در بزم ہا خاطر نواز — سوزِ او در رزم ہا آہن گداز
در گلستاں با عنادل ہم صفیر — در بیاباں جرہ بازِ صید گیر

مردِ مومن خدا کی صفاتِ جلال و جمال دونوں کا حامل ہوتا ہے لیکن یہ دونوں صفات اس انداز سے ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہوتی ہیں کہ ان میں ایک دوسرے کی جھلک صاف نظر آ جاتی ہے۔ مثلاً اگر وہ کسی مجرم کو سزا دیتا ہے تو اس میں وحشیانہ جذبۂ انتقام کے بجائے مصلحِ خیر سگالی کا انداز نمایاں ہوتا ہے۔ وہ " اشداء علی الکفار۔ رحماء بینھم " کی عملی تفسیر ہوتا ہے — حلقۂ یاراں میں بریشم کی طرح نرم — اور مصافِ زندگی میں سیرتِ شمشیر کا مظہر۔ کوہ و بیاباں سے سیلِ تند رو بن کر گذر جانے والا اور گلستان راہ میں آ جائے تو جوئے نغمہ خواں کا پیکر اختیار کر لینے والا۔

زیرِ گردوں می نیاساید دلش — بر فلک گیرد قرار آب و گلش
طائرش منقار بر اختر زند — آں سوئے ایں کہنہ چنبر پر زند

مردِ مومن کے نزدیک زندگی نقطۂ آب و گل کا کھیل نہیں کہ طبعی قوانین کے مطابق جئے اور انہی قوانین کے مطابق مر گئے۔ وہ مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اور زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح وہ "اقطار السمٰوٰت والارض" سے آگے نکل جاتا ہے۔

یہ تو ہے مردِ مومن کا مقام۔ اس کے برعکس،

تو، بہ پروازے پرے نکشودۂ
کرمک استی زیرِ خاک آسودۂ

تیری یہ کیفیت ہے کہ تو نے کبھی اڑنے کے لئے اپنے پر ہی نہیں کھولے۔ تو کیڑوں مکوڑوں کی طرح، مٹی سے پیدا ہوتا ہے اور مٹی میں زندگی بسر کرنے سے خوش رہتا ہے۔ یہ زندگی، انسانی زندگی نہیں حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ "بل ھم اضل" بلکہ ان سے بھی گئی گزری۔

خوار از مہجوریٔ قرآں شوی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شوی

تم اپنی اس ذلت کے لئے "فلکِ ناہنجار" کو ذمہ دار قرار دیتے ہو حالانکہ اس میں فلک کی گردش (تقدیر) کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ تم نے قرآن کو چھوڑ دیا ہے۔

اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ
در بغل داری کتابِ زندۂ

تمہاری حالت یہ ہے کہ قرآن کریم جیسی حیات بخش (انسانیت ساز) کتاب اپنی بغل میں دبائے دبائے پھرتے ہو (لیکن چونکہ اس پر عمل نہیں کرتے اس لئے) دنیا میں ذلت و خواری کی زندگی بسر کرتے ہو۔ کس قدر تاسف انگیز (عبرت خیز) ہے یہ کیفیت کہ ایسی زندگی بخش کتاب کی حامل قوم اس قدر ذلیل و خوار ہو!

تا کجا در خاک می گیری وطن
رخت بر دار و سرِ گردوں فگن

تم کب تک ذلت و پستی کی حالت پر مطمئن رہو گے؟ اسے چھوڑ دو۔ قرآن کا دامن تھامو اور زمین کی پستیوں سے اٹھ کر آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچو۔ یہی اس قوم کا شعار ہونا چاہیئے جو صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرلے۔

خاتمۃ الکتاب - عرضِ حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمینؐ

مثنوی کے آخری باب میں علامہ اقبالؒ نے بحضور نبی اکرمؐ اپنی عرضداشت پیش کی ہے جو تپش و خلش، سوز و گداز، احترام و عقیدت اور عشق محبت کا بڑا دلآویز مرقع ہے۔ اس کا پہلا شعر ہی اتنا بلند ہے کہ (ہمارے خیال میں) نعت کی دنیا میں اس کا جواب بمشکل مل سکے گا۔ یعنی

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی
جلوہ است تعبیرِ خوابِ زندگی

اے وہ کہ جس کے ظہورِ قدسی سے انسانی زندگی (یعنی خود انسانیت) شباب پر آگئی اور جس نے حیاتِ انسانی کے خواب کو ایک نئی اور صحیح تعبیر عطا کر دی جس کی تشریف آوری سے انسانیت اپنے عہدِ طفولیت سے نکل کر بلوغت تک پہونچ گئی تاکہ وہ قرآنِ کریم کے غیر متبدل اور ابدی اصولوں کی روشنی میں شاہراہِ حیات پر آگے بڑھتی چلی جائے اور اس طرح اس منزل تک پہنچ جائے جو اس کے خواب کی تعبیر ہے۔

اے زمیں از بارگاہت ارجمند — آسماں از بوسہ بامت بلند
شش جہت روشن زتاب روئے تو — ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
از تو بالا پایۂ ایں کائنات — فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات

زمین کے لئے یہ امر باعثِ ہزار شرف و افتخار ہے کہ وہ حضورؐ کی بارگاہِ عالی کی محل بنی۔ آسمان کی سربلندی کی وجہ یہ ہے کہ اس نے بارگاہِ عالی کی بامِ بلند کو بوسہ دیا۔ دنیا میں روشنی جہاں کہیں بھی ہے وہ آپؐ ہی کے جلوہ کی رہینِ کرم ہے۔ شرق و غرب کے انسان سب اُس بارگاہ کے حلقہ بگوش ہیں۔ حضورؐ کی تشریف آوری سے کائنات کا مرتبہ بلند ہوگیا۔ آپؐ کا فقر، وجہ سرمایۂ کائنات ہے۔

در جہاں شمعِ حیات افروختی
بندگاں را خواجگی آموختی

آپؐ نے بزمِ ہستی میں زندگی کی شمع روشن کی اور غلاموں کو آئینِ جہاں بانی و جہاں آرائی سکھائے۔

بے تو از نابود مندیہا خجل
پیکرانِ ایں سرائے آب و گل

اگر آپؐ تشریف نہ لاتے تو دنیا میں بسنے والے بے جان انسانوں کو شرفِ حیات نصیب نہ ہوتا۔

تارمِ تو آتشے از گل کشود
تودہ ہائے خاک را آدم نمود

زندگی کی چنگاریاں راکھ کے ڈھیر کے نیچے دبی ہوئی تھیں۔ آپؐ کے دمِ مسیحائی سے راکھ اڑ گئی اور زندگی ایک شعلۂ جوالہ بن کر پیکرِ آدم کی شکل میں سامنے آگئی۔

ذرہ دامن گیر مہر و ماہ شد

یعنی از نیروئے خود آگاہ شد

اس طرح پیکرِ آدم کے خاک کے ذرّے اپنی مضمر قوتوں سے آشنا ہو گئے اور انھوں نے سورج اور چاند پر اپنی کمندیں پھینکنا شروع کر دیں۔

تا مرا افتاد بر رویت نظر

از اب و ام گشتہٴ محبوب تر

جب سے میری نگاہوں کے سامنے آپؐ کا جلوہ بے نقاب ہو کر آیا ہے، آپؐ میرے لئے ماں باپ سے بھی زیادہ محبوب و عزیز ہو گئے ہیں۔

عشق در من آتشے افروخت است زحمتش بادا کہ جانم سوخت است

نالہٴ مانند نے سامانِ من آں چراغِ خانہٴ ویرانِ من

آپؐ کے عشق نے میرے پیکرِ خاکی میں آگ کے شعلے بھڑکا دیئے ہیں۔ اس جانسوزی میں اس قدر لذت ہے کہ ایک ایک سانس میں آپؐ کے لئے ہزار ہزار دعائیں نکلتی ہیں۔ اس عشق کا درد، اور درد سے آہ و فغاں، میرے لئے سامانِ زیست ہے۔ اسی چراغ سے میرا خانہٴ ویران روشن ہے۔

از غمِ پنہاں نگفتن مشکل است

بادہ در مینا نہفتن مشکل است

لیکن ایک غم ایسا ہے جسے چھپایا نہیں جا سکتا۔ وہ غم کسی ایسی چیز کا نہیں جس کا تعلق میری ذات سے ہو۔ وہ غم ملتِ اسلامیہ کا ہے۔ اور وہ غم یہ ہے کہ

مسلم از سرِّ نبیؐ بیگانہ شد باز ایں بیت الحرم بت خانہ شد

از منات و لات و عزّیٰ و ہبل ہر یکے دارد بتے اندر بغل

غم یہ ہے کہ مسلمان دین کی حقیقت سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ اس نے خدائے واحد کی محکومیت کو چھوڑ کر غیر خداوندی قوتوں کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔

شیخِ ما از برہمن کافر تر است

زانکہ او را سومنات اندر سر است

یہ حالت ہمارے عوام ہی کی نہیں۔ مذہبی پیشواؤں کی حالت ان سے بھی بدتر ہے۔ یہ لوگ برہمنوں سے بھی بڑھ کر کافر ہیں۔ اس لئے کہ برہمن تو ایک خارجی بُت کے سامنے جھکتا ہے اور ہمارے ان "دین کے علمبردار" برہمنوں کی فکر و نظر کا خزانہ ہو چکی ہے۔ ان کے عقائد و تصورات غیر اسلامی ہیں۔

رخصتِ ہستی از عرب برچیدہٴ در خنستانِ عجم خوابیدہٴ

شل ز برفابِ عجم اعضائے او سرد تر از اشکِ او صہبائے او

انھوں نے دین کو اس کی اصل و حقیقت سے الگ کر کے غیر قرآنی (عجمی) تصورات کو عینِ دین بنا رکھا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ کہ دینِ حقیقی نے ان کے اندر جو حرکت و حرارت پیدا کی تھی، اس کے بجائے ان کے قوائے عملیہ یکسر مفلوج ہو چکے ہیں۔ اور ان کے سینوں میں آتشِ ایمان

سرد پڑ چکی ہے۔

ہمچو کافر از اجل ترسندۂ
سینہ اش فارغ ز قلب زندۂ

ان کے سینے میں قلب زندہ باقی نہیں رہا جس کی وجہ سے ان کی حالت یہ ہوگئی ہے کہ موت کے نام سے ان کی جان نکلتی ہے۔ حالانکہ مومن کا شعار یہ تھا کہ

چو مرگ آید تبسم برلب اوست

وہ حق کی خاطر جان دینے میں راز حیات سمجھتا تھا۔ اس لئے موت کو آگے بڑھ کر گلے سے لگا لیتا تھا۔

نعش از پیش طبیباں بردہ ام
در حضور مصطفےٰ آوردہ ام

اس مسلمان کی حالت یہاں تک پہونچ چکی ہے کہ دنیا کا کوئی طبیب اس کا علاج نہیں کر سکتا۔ ہر ایک نے جواب دیدیا ہے۔ اس لئے میں اب اس قریب المرگ مریض کو بحضور مصطفےٰ لایا ہوں کیونکہ اس کے امراض کا علاج وہیں سے ہو سکتا ہے۔ "پیش مصطفیٰ" لانے سے مطلب یہ ہے کہ

مردہ بود از آب حیواں گفتمش
سرے از اسرار قرآں گفتمش

یہ مردہ تھا۔ میں نے اسے ایسا پیغام دیا ہے جو اسے حیاتِ جاوید عطا کردے۔ یعنی میں نے (اس مثنوی میں) اس کے سامنے قرآن کے اسرار و رموز میں سے ایک راز کھول کر بیان کر دیا ہے۔

داستانے گفتم از یارانِ نجد
نکہتے آوردم از بستانِ نجد

میں نے اس کے سامنے اُن سچے مومنین کی زندگی واضح طور پر رکھ دی ہے جنھوں نے حرارتِ قرآنی سے نبضِ ہستی میں تموج پیدا کر دیا تھا۔ میں گلستانِ عشق و محبت سے اس کے لئے بوئے وفا لایا ہوں۔

محفل از شمع نوا افروختم
قوم را رمزِ حیات آموختم

میں نے اپنی آہ و فغاں سے ایک شمع روشن کی ہے اور اس طرح قوم کو زندگی کا راز سکھایا ہے۔

گفت برما بند د افسونِ فرنگ
ہست غوغایش ز قانونِ فرنگ

ہمارے قدامت پرست طبقہ کی تو یہ حالت ہے کہ انھوں نے زندگی کے تمام نظریات و تصورات "عجم" سے مستعار لے رکھے ہیں لیکن جدید طبقہ پر

تہذیب مغرب کا جادو چل گیا ہے اور ان میں سے ہر ایک وہیں کی بولی بولتا ہے۔

اے بصیری را ردا بخشندهٔ
بربط سلمیٰ مرا بخشندهٔ

قصیدہ بردہ کے مصنف بصیری کے متعلق مشہور ہے کہ جب اس نے حضورؐ کی شانِ اقدس میں اپنا قصیدہ لکھا تو حضورؐ نے خواب میں اُسے اپنی چادرِ مبارک عطا فرمائی تھی اور مجھے نغمہ سرائی کی وہ صلاحیت بخشی ہے جس سے میں قرآن کا پیغام ہر جگہ پہنچاتا ہوں۔

اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے بصیری کو وہ کچھ عطا فرمایا اور مجھے یہ نعمت عنایت کی۔ اب درخواست ہے کہ

ذوقِ حق دہ ایں خطا اندیش را
اینکہ نشناسد متاعِ خویش را

حضورؐ، مسلمانوں کو، جو اپنی متاعِ گم گشتہ کو بھی نہیں پہچانتے، حق شناسی کا ذوق عطا فرمادیں تاکہ قرآن کا جو پیغام میں ان کے سامنے پیش کر رہا ہوں یہ اسے پہچان سکیں۔

اس کے بعد چند اشعار میں حضرت علامہؒ نے اُس حقیقت کا انکشاف کیا ہے جو ان کے پیغام کی اصل و بنیاد ہے۔ آپ نے عام طور پر دیکھا ہوگا کہ ہمارے ہاں کا "اہل علم و تحقیق" طبقہ آئے دن اس نکتہ پر بحث کرتا رہتا ہے کہ علامہ اقبالؔ کے فلسفہ اور پیغام کے مآخذ کیا تھے؟ یعنی انھوں نے یہ خیالات کہاں سے لئے تھے؟ اس کے لئے کوئی نیٹشے کا نام لیتا ہے کوئی برگسان کا۔ کوئی اُنھیں الیگزنڈر کا خوشہ چیں بتاتا ہے کوئی سپنوزا کا۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی خود اقبالؔ سے نہیں پوچھتا کہ آپ کے فکر کا مآخذ کیا ہے۔ اس کے متعلق انھوں نے اپنی پہلی تصنیف —— یعنی مثنوی زیر نظر —— میں اس وضاحت سے لکھ دیا ہے کہ اس کے بعد کسی تحقیق و تفتیش کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ سنئے کہ وہ اس باب میں کیا کہتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

گر دلم آئینۂ بے جوہر است
ور بحرفم غیرِ قرآں مضمر است

اگر میرا دل ایسا آئینہ ہے جو یکسر صاف اور شفاف نہیں اس میں کسی قسم کی آمیزش ہے۔ اور جو کچھ میں نے کہا ہے اگر اس میں غیر از قرآن کچھ بھی ہے۔

تو —— !!

اس —— تو —— کے متعلق حضرت علامہ نے جو کچھ کہا ہے اسے پڑھنے کے لئے فی الحقیقت شاہیں کا جگر چاہیئے چیتے کا کلیجہ

آپ کہتے ہیں کہ

میں نے جو کچھ کہا ہے اگر اس میں قرآن کے علاوہ کچھ بھی اور
ہو ــــ تو

اے فروغت صبحِ اعصار و دہور
چشمِ تو بینندۂ مافی الصدور

تو ــــ اے وہ ذاتِ رسالت مآبؐ! کہ جس کے جلوے سے تمام زمانوں کو روشنی عطا ہوئی ہے۔ اور جو لوگوں کے حالات تک سے بھی باخبر ہے۔[1]

پردۂ ناموسِ فکرم چاک کن
ایں خیاباں را ز خارم پاک کن

میری فکر کے ناموس کا پردہ چاک کر دے۔ لوگوں پر اس حقیقت کو بے نقاب کر دے کہ یہ شخص اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ اس کی کوئی نہ سنے اس کا کوئی اعتبار نہ کرے۔ اور اس طرح گلستانِ ملت کو اس کانٹے سے پاک اور صاف کر دے۔

تنگ کن رختِ حیات اندر برم
اہلِ ملت را نگہدار از شرم

میرا عرصۂ حیات مجھ پر تنگ کر دے۔ مجھے ذلیل و رسوا کر دے اور اس طرح ملت کو اس ندامت سے بچا لے جو اسے اس صورت میں لاحق ہو سکتی ہے کہ وہ میری فکر کو قرآنی سمجھ کر اسے حق و صداقت کی آواز قرار دے لے اور بعد میں یہ راز کھلے کہ وہ کس قدر فریب میں مبتلا رہی۔

سبز کشتِ نابسامانم مکن
بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن

مجھ سوختہ بخت کی کشتِ امید کو کبھی سرسبز و شاداب نہ ہونے دے اور مجھے ابرِ نیسانِ بہار کے ایک قطرہ تک سے محروم کر دے۔

خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مے کافورِ من

میری فکر کے تاکستانوں میں جو خوشے لٹک رہے ہیں، ان میں شراب بننے کی صلاحیت سلب کر لے۔ اور جو شراب کافوری میری صراحی میں ہے اسے زہر آلود بنا دے۔

حضرت علامہ نے اپنے حق میں جن بددعاؤں کو یہاں تک گنایا ہے وہ بھی اپنی شدت اور تلخی میں کچھ کم نہیں۔ لیکن اس کے بعد اگلے شعر میں، آپ نے جو کچھ کہا ہے، اس سے زیادہ کچھ اور نہیں کہا جا سکتا۔ اور، جو حضرات حضرت علامہؒ کے سوزِ قلب سے باخبر ہیں، وہ اس کا بھی طرح سے احساس کر سکتے ہیں کہ یہ بات انھوں نے کس طرح دل پر پتھر رکھ کر کہی ہو گی۔ کہ

---

[1] بینندۂ مافی الصدور ــ دلوں کے حالات سے باخبر، صرف خدا کی صفت ہے۔ رسول اللہؐ نے اپنے متعلق اس کا دعوےٰ نہیں فرمایا۔

جو کچھ میں نے کہا ہے اگر اس میں کوئی ایک بات بھی غیر از
قرآن ہو ــــ تو

روزِ محشر خوار و رُسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

یہ بد دعا کی انتہا ہے! اس سے زیادہ کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا!! یہ تمام بد دعائیں حضرت علامہ نے کس بات کے لئے اپنے اوپر وارد کی ہیں؟ اس بات کے لئے کہ ــــ اگر میرے پیغام میں قرآن کے علاوہ کچھ بھی اور ہو تو مجھے یہ سزا ملے!

اس کے برعکس،

گر دُرِ اسرارِ قرآں سفتہ ام
با مُسلماناں اگر حق گفتہ ام

اگر میں نے قرآن ہی کی تعلیم کو پیش کیا ہے اور مسلمانوں سے جو کچھ کہا ہے وہ حق ہے۔ تو ــــ

ایچہ از احسانِ تو ناکس، کس است
یک دعایت مزدِ گفتارم بس است

اے وہ فیاضِ گرامی کہ جس پر تیرا احسان ہو جائے وہ ذرۂ بے مقدار دنیا بھر کی عزتوں کا مالک بن جائے ــــ آپؐ سے میری فقط اتنی درخواست ہے کہ

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل — عشق من گردد ہم آغوشِ عمل
دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ — بہرۂ از علم ایں بخشیدۂ
در عمل پائندہ تر گرداں مرا
آبِ نیسانم اگر گرداں مرا

آپؐ اللہ تعالےٰ سے میرے لئے دعا فرمائیں کہ اس نے جہاں مجھے علم دیں سے اس قدر بہرۂ وافر عطا فرمایا ہے، مجھے عمل کی توفیق بھی عطا کرے۔ آپؐ کی یہ دعا میری تمام محنت و کاوش کا بہترین معاوضہ ہوگی۔

یہ تھی حضرتِ علامہ کی ایک آرزو۔ اس کے بعد اپنی ایک اور آرزو کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

رختِ جاں تا در جہاں آوردہ ام — آرزوئے دیگرے پروردہ ام
ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است — محرم از صبحِ حیاتم بودہ است
از پدر تا نامِ تو آموختم — آتشِ ایں آرزو افروختم

تا فلک دیرینہ تر سازد مرا در خمارِ زندگی بازد مرا

آرزوئے من جواں تر می شود ایں کہن صہبا گراں تر می شود

ایں تمنا زیر خاکم گوہر است در شبم تابِ ہمیں یک اختر است

یہ آرزو وہ ہے جو میری زندگی کے ساتھ میرے دل میں پیدا ہوئی اور اس کے ساتھ ہی بڑھتی چلی گئی۔ جب میں نے اپنے والد محترم سے حضورؐ کا اسم گرامی پہلی بار سیکھا تو اسی دن سے اس آرزو کی چنگاری میری آب و گِل میں روشن ہو گئی۔ پھر جوں جوں آسمان مجھے عمر میں آگے بڑھاتا گیا یہ آرزو جوان سے جوان تر ہوتی چلی گئی۔ یہ آرزو میرے جسدِ خاکی میں گوہرِ تابدار کی حیثیت رکھتی ہے۔ میری زندگی کی شبِ تاریک میں اسی ستارۂ درخشندہ سے روشنی ہے۔

اس تمہید کے بعد یہ توقع ہوتی ہے کہ حضرت علامہ اپنی اس آرزو کا اظہار کر دیں گے۔ لیکن وہ آرزو ایسی نہیں جس کا اظہار اتنی جلدی کر دیا جائے۔ اس تک پہنچنے کے لئے ابھی مزید تامل کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں وہ کہتے ہیں۔

مدتے با لالہ رویاں ساختم عشق با مرغولہ مویاں باختم

بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم بر چراغِ عافیت داماں زدم

برقہا رقصید گردِ حاصلم رہزناں بردند کالائے دِلم

ابتدائی زندگی میں مدتوں میری یہ حالت رہی کہ میں نے گھنگھریالے بالوں والے مہ وشوں سے عشق بھی کیا۔ ان کے ساتھ مصروفِ بادہ نوشی بھی رہا۔ اس طرح میری متاعِ حیات لٹتی رہی۔ سب کچھ برباد ہوتا رہا۔ لیکن

ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت
ایں زرِ سالم ز داما نم نہ ریخت

یہ آرزو میرے دل سے نہ گئی۔ یہ زرِ خالص میری گرہ سے نہ گرا۔ یہ تمنا بدستور میرے قلب کی گہرائیوں میں پرورش پاتی رہی۔

پھر یہ بھی ہوا کہ

عقل آزر پیشہ ام زنار بست نقشِ او در کشورِ جانم نشست

سالہا بودم گرفتارِ شکے از دماغِ خشکِ من لاینفکے

حرفے از علم الیقیں ناخواندۂ در گمان آبادِ حکمت ماندۂ

ظلمتم از تابِ حق بیگانہ بود شامم از نورِ شفق بے گانہ بود

مدتوں میں شکوک و شبہات کی وادیوں میں سرگرداں رہا۔ خشک فلسفہ نے مجھ سے یقین و ایمان کی دولت چھین لی اور مجھے گرفتارِ بے یقینی کر دیا۔ ایک زمانہ تک میرے ظلمت آباد قلب میں نورِ حق کی ایک کرن تک کا گذر نہ ہوا ـــــ لیکن

ایں تمنا در دِلم خوابیدہ بود در صدف مثلِ گہر پوشیدہ بود

شکوک و شبہات کے اس بحرِ متلاطم میں بھی یہ آرزو میرے دل سے جدا نہ ہوئی بلکہ اس میں یوں پرورش پاتی رہی جیسے صدف میں گوہر آب دار پرورش پاتا ہے۔

مدتوں یہ آرزو میرے دل کی گہرائیوں میں خوابیدہ رہی۔

آخر از پیمانۂ چشمم چکید
در ضمیرِ من نوا ہا آفرید

بالآخر یہ بیتابانہ آنسو بن کر میری آنکھ کے آبگینے سے ٹپک پڑی۔ اور اس نے میرے ضمیر میں آہ و فغاں کی ایک دنیا بپا کر دی۔

اے ز یادِ غیر تو جانم تہی
بر لبش آرم اگر فرماں دہی

میرے دل میں آپ کی یاد کے سوا اور کچھ نہیں۔ اگر آپ اجازت دیں تو اس آرزو کو لب پر لاؤں؟

اس کے بعد تو یقیناً یہ توقع ہوگی کہ حضرت علامہ اپنی اس آرزو کو "جو ان کے نزدیک ماحصلِ زندگی تھی" بیان کر دیں گے۔ لیکن ابھی نہیں۔ اس میں اب بھی تامل ہے۔ فرماتے ہیں۔

زندگی را از عمل ساماں نبود | پس مرا ایں آرزو شایاں نبود
شرم از اظہارِ او آید مرا | شفقتِ تو جرأت افزاید مرا

اصل یہ ہے کہ مجھ سے بے عمل انسان کو یہ زیب ہی نہیں دیتا تھا کہ اس قسم کی آرزو اپنے دل میں رکھے۔ یہ وجہ ہے کہ مجھے اس کے اظہار میں اب بھی ندامت محسوس ہوتی ہے لیکن حضورؐ کی شفقت مجھے جرأت دلاتی ہے کہ میں اسے لب تک لے آؤں۔

اب سنئے وہ آرزو! پہلے مصرعہ میں کہتے ہیں۔

ہست شانِ رحمتت گیتی نواز

تیری رحمت ساری کائنات کو نوازتی ہے۔ چہ عجب کہ وہ میری اس آرزو کو بھی شرفِ پذیرائی عطا کر دے۔ وہ آرزو یہ ہے کہ

آرزو دارم کہ میرم در حجاز

مجھے سرزمینِ حجاز میں موت آ جائے۔

یہ تھی وہ آرزو کہ جسے حضرت علامہ ساری زندگی اپنے دل کی گہرائیوں میں نشو و نما دیتے رہے — یعنی حجاز میں مرنے کی آرزو۔

اس کی وجہ یہ بیان کرتے ہیں کہ

مسلمے از ما سوا بیگانۂ | تا کجا زناریٔ بتخانۂ
حیف چوں او را سر آید روزگار | پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من | وائے امروزم، خوشا فردائے من

مسلمان جس کا ایمان یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کے سامنے نہ جھکا جائے، وہ ہندوستان میں غیروں کی محکومی میں زندگی بسر کر رہا ہے۔ اس کی زندگی تو یوں گذر رہی ہے لیکن اگر مرنے کے بعد اس کی لاش بھی اسی بُت کدہ میں دفن ہو جائے تو اس سے زیادہ تاسف انگیز حادثہ اور کیا ہوگا! اس لئے میری آرزو ہے کہ مجھے حجاز میں موت آئے تاکہ جب میں مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوں تو میرے اجزائے جسم حضورؐ کے دروازے سے اٹھیں اور میں اس بات پر فخر کر سکوں کہ اگرچہ میری زندگی بُت خانے میں گذری لیکن میرا انجام اس قدر قابلِ رشک ہوا۔

دیارِ حبیبؐ میں مرنے کی تمنا یقیناً عشق کا تقاضا ہے اور یہی وہ شدتِ جذبات ہے جو حضرت علامہ اقبالؒ کی اس آرزو کی محرک تھی۔ ورنہ حقائق کی دنیا میں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ انسان کا جسم کس مقام پر دفن ہوتا ہے۔

فرخا شہرے کہ تو بودی در آں　　　اے خنک خاکے کہ آسودی دراں

مسکنِ یار است و شہرِ شاہِ من　　　پیشِ عاشق، ایں بود حب الوطن"

کس قدر مبارک و مسعود ہے دیارِ محبوب۔ جسے "حب الوطن" کہتے ہیں وہ اسکے سوا کچھ نہیں کہ محبوب کے وطن سے محبت کی جائے۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ پھر اپنی استدعا کو ان الفاظ میں دہراتے ہیں۔

کوکبم را دیدۂ بیدار بخش　　　مرقدے در سایۂ دیوار بخش

تا بیاساید دلِ بیتابِ من　　　بستگی پیدا کند سیمابِ من

حضورؐ سے التجا ہے کہ مجھے اپنی دیوار تلے مرقد کے لئے زمین عطا فرما دیں۔ تاکہ میرا بختِ خفتہ بیدار ہو جائے۔ اور قلبِ مضطر کو تسکین حاصل ہو جائے۔ اور اس کے بعد

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغازم۔ انجامم نگر

میں آسمان سے بصد ہزار فخر و مسرت کہہ سکوں کہ تو نے میری زندگی کا آغاز بھی دیکھا تھا (کہ کیسا ناشاد و نامراد تھا) اب اس کا انجام دیکھ کہ کس قدر پُرسکون و شاداب ہے!

یہ مثنوی رموزِ بیخودی کا آخری شعر ہے۔ حضرت علامہ نے اپنی دعا میں جس حقیقت کو واضح کیا ہے، اس کے پیشِ نظر اس امر کے تعین میں کوئی مشکل نہیں رہ جاتی کہ آپ کی فکر کا ماخذ کیا تھا؟ یہ ماخذ تھا قرآن عظیم جس کے پیغام کو وہ عمر بھر نشر کرتے رہے۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کسی کو کسی خاص مقام پر علامہؒ کے فہمِ قرآن سے اختلاف ہو (ہمیں خود بعض مقامات پر اختلاف ہے جسکی صراحت سابقہ صفحات میں اپنے اپنے مقام پر کر دی گئی ہے) لیکن اس حقیقت کے اعتراف میں تو کسی کو اختلاف نہیں ہونا چاہیئے کہ علامہ اقبالؒ نے اپنی بصیرت کے مطابق، قرآنی پیغام ہی کو پیش کیا اور یہی ان کی فکر کا ماخذ تھا۔ جہاں تک ہماری نگاہ یاوری کرتی ہے ہمیں اپنی ساری تاریخ میں کوئی اور شخصیت ایسی نظر نہیں آتی جس نے اس انداز سے قرآنی پیغام کو عام کیا ہو۔ اور یہی حضرت علامہؒ کی وہ خصوصیت ہے جس کی بنا پر ہمارے دل میں ان کا اس قدر احترام ہے اور ان کی اس دعوت میں، ہمہ تن زبان بن کر اُن کے ہمنوا ہیں کہ

گر تو می خواہی مسلماں زیستن　　　نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

جب تک کسی قوم میں فکرِ تازہ کی نمود نہ ہو اس میں حیاتِ تازہ کی نمود نہیں ہو سکتی۔ اگر آپ یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ فکرِ تازہ آپ کو کہاں سے ملیگی تو ان چند صفحات کو غور سے پڑھیئے۔

۱۔ ابلیس و آدم

پہلا انسان کس طرح پیدا ہوا؟ قصۂ آدم سے کیا مراد ہے؟ ملائکہ کیا ہیں؟ ابلیس، شیطان اور جنات کون ہیں؟ وحی کی حقیقت کیا ہے؟ ان تمام سوالات کے متعلق، فکرِ تازہ آپ کو "ابلیس و آدم" میں ملے گی۔

بڑی تقطیع۔ قیمت۔ آٹھ روپے

۲۔ جوئے نور

آسمانی انقلاب کی شعلہ و شبنم آمیز داستان۔ از حضرت نوحؑ تا حضرت شعیبؑ۔ اقوامِ گذشتہ کا عبرت انگیز انجام۔

بڑی تقطیع۔ قیمت۔ چھ روپے

۳۔ برقِ طور

حکمتِ کلیمی اور سیاستِ فرعونی کی کشمکش۔ قوموں کے عروج و زوال کے ابدی قوانین۔ بنی اسرائیل کی سبق آموز داستان۔

تقطیع کلاں قیمت چھ روپے

۴۔ شعلۂ مستور

مسیحائے بنی اسرائیل حضرت عیسیٰؑ کی انقلاب آفریں زندگی ایک نئے زاویے سے۔ عجیب و غریب حقائق کی نقاب کشائی۔ رہ و رسمِ خانقاہیت کی سبق آموز حکایت۔ بڑی تقطیع۔ قیمت چھ روپے

۵۔ معراجِ انسانیت

حضور خاتم النبیینؐ کی حیاتِ طیبہ قرآنِ کریم کے آئینہ میں۔ سیرتِ مقدسہ پر حسین ترین تصنیف۔ سابقہ کتبِ سماوی کی حیرت انگیز کہانی ختمِ نبوت کا عظیم فلسفہ۔ بڑا سائز۔ قریب نو سو صفحات۔ اعلیٰ درجہ کا دلایتی کاغذ۔

قیمت۔ بیس روپے

۶۔ من و یزداں

خدا کا ماننا کیوں ضروری ہے؟ کس قسم کے خدا کا ماننا؟ خدا اور انسان کا کیا تعلق ہے۔ اگر خدا کو نہ مانا جائے تو کیا بگڑتا ہے؟ اور ماننے سے کیا سنورتا ہے؟ عجیب و غریب کتاب ہے۔

تقطیع کلاں قیمت دس روپے

۷۔ انسان نے کیا سوچا؟

دنیا کی کسی زبان میں اس انداز کی کتاب نہیں مل سکیگی۔ اس سوال کا جواب کہ کیا تنہا عقلِ انسانی زندگی کے مسائل کا اطمینان بخش حل پیش کر سکتی ہے؟ اگر نہیں کر سکتی تو پھر اس کا علاج کیا ہے؟ افلاطون سے لے کر عصرِ حاضر کے مفکرین، مؤرخین، سائنسدانوں کی محیر العقول کتابوں کے سینکڑوں اقتباسات۔ تقطیع کلاں۔ (عنقریب دوسرا ایڈیشن شائع ہو جائے گا)

۸۔ سلیم کے نام خطوط

ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں اسلام کے متعلق طرح طرح کے سوالات پیدا ہوتے ہیں جن کا انھیں کہیں سے اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ ان کا جواب اِن خطوط میں ملیگا اپنے انداز کی نرالی کتاب ہے جس نے نوجوانوں کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ خوبصورت ٹائپ کی طباعت جلد اوّل۔ آٹھ روپے۔ جلد دوم (زیر طبع)

۹۔ طاہرہ کے نام خطوط

طاہرہ بیٹی کو گلہ تھا کہ سلیم بیٹے کے شکوک کو تو رفع کر دیا لیکن عورتوں کے متعلق قرآن کیا کہتا ہے یہ کہیں نہیں بتایا؟ اِن خطوط میں یہی بتایا گیا ہے اور بڑے ہی دلآویز انداز میں بتایا گیا ہے۔ کتاب دو حصّوں میں شائع ہوئی ہے۔ حصہ اوّل دو روپے۔ حصہ دوم۔ دو روپے آٹھ آنے

۱۰۔ اسبابِ زوالِ اُمّت

مسلمان دنیا میں جہاں بھی ہیں، غیر مسلموں کے مقابلہ میں پست ہیں۔ اس کی بالآخر کیا وجہ ہے؟ عجیب تشخیص اور لاجواب علاج۔ قیمت۔ دو روپے

۱۱۔ اِسلامی معاشرت

روزمرّہ کی زندگی کے متعلق قرآن کیا ہدایات دیتا ہے۔ بچوں، عورتوں، کم پڑھے لکھے مردوں، طالبعلموں لڑکیوں۔ لڑکوں سب کے لئے مفید اور نہایت کارآمد کتاب۔ قیمت ۱۰ دو روپے

۱۲۔ قرآنی فیصلے

کتنی باتیں ہیں جنھیں آپ یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ وہ عین اسلام کے مطابق ہیں لیکن وہ اسلام کے مطابق نہیں ہوتیں۔ وہ کون سی باتیں ہیں اور کیوں اسلام کے مطابق نہیں۔ اسلام کے مطابق کیا ہے؟ اس کا جواب اِس کتاب میں ملے گا۔ قیمت۔ چار روپے۔

۱۳۔ اِسلامی نِظام

اسلامی مملکت کا نظام کیسا ہونا چاہیئے۔ اس سوال کا حقیقت کشا جواب قرآن کی روشنی میں۔ دو روپے

۱۴۔ قرآنی دستور پاکستان

۱۹۵۶ء کا دستور پاکستان کیوں اسلامی نہیں تھا! اسلامی دستور کو کیسا ہونا چاہیئے عجیب و غریب تبصرہ اور بے لاگ تنقید۔ قیمت۔ دو روپے آٹھ آنے

۱۵۔ اِسلام میں قانون سازی کا اصول

آئین پاکستان کی تدوین کے بعد سب سے پہلا سوال یہ سامنے آتا ہے کہ اس ملک میں قانون سازی کا اصول کیا ہوگا؟ اس اہم سوال کے متعلق عالم اسلامی کے ممتاز مقننین و مفکرین کی فکر کے نتائج۔ قیمت۔ دو روپے آٹھ آنے

۱۶۔ جشن نامے

قیام پاکستان کے بعد، ابتدائی چند برسوں میں قوم کے مشفق راہ نماؤں نے ہر سال جشنِ آزادی کس طرح منایا؟ کتاب نہیں، ان "حضرات" کی عجیب ذہنیت اور مضحکہ انگیز حرکات کا دلکش مرقع ہے۔ جس سے لب پر ہنسی آجاتی ہے۔ لیکن آنکھوں میں آنسو بھر آتے ہیں۔ قیمت۔ دو روپے آٹھ آنے

۱۷۔ مزاج شناسِ رسول

(سابق) جماعت اسلامی کے امیر کی زندگی کی کہانی ـــ نقاب اٹھ جانے کے بعد ـــ عبرت آموز اور معلومات افزا کتاب قیمت ۱۰ چار روپے

۱۸۔ اقبال اور قرآن

فکر اقبال کا اصل سرچشمہ کیا تھا؟ اقبال نے قرآنی تعلیم کو کس حسین انداز میں پیش کیا؟ اس موضوع پر بے نظیر تصنیف ہے　　قیمت:۔ دو روپے

۱۹۔ نظامِ ربوبیت

کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں کوئی شخص نہ بھوکا رہے نہ ننگا۔ نہ بیمار رہے نہ جاہل۔ نہ کوئی امیر رہے نہ غریب۔ نہ کوئی قارون ہو نہ بھکاری ۔۔۔ ایسا ہو سکتا ہے! کیسے؟ قرآن کے نظامِ ربوبیت سے جس کی بصیرت افروز تفصیل اس کتاب میں ملیگی۔ اس نے نظامِ سرمایہ داری اور اور اشتراکیت دونوں کی بنیادیں ہلادی ہیں۔　　قیمت:۔ چار روپے

۲۰۔ تاریخ الامت
(علامہ اسلم جیراجپوری)

ظہور اسلام سے لے کر خلافت عثمانیہ کے خاتمہ تک کی تاریخ سات حصوں میں اور پوری تاریخ پر تبصرہ آٹھویں حصہ میں۔ ہر حصہ الگ الگ اور فی ذاتہٖ مکمل ہے۔

حصہ اول -/۲/- حصہ دوم -/۸/۲ حصہ سوم -/۲/- حصہ چہارم -/۸/۲ حصہ پنجم -/۳/- حصہ ششم -/۸/۲ حصہ ہفتم -/۲/- حصہ ہشتم -/۸/۲

۲۱۔ نوادرات

علامہ اسلم جیراجپوری کے مضامین کا مجموعہ۔ دین و دانش اور علم و ادب کا مرقع۔
بڑا سائز　　قیمت:۔ چار روپے

۲۲۔ الفتنۃ الکبریٰ

مصر کے (نابینا) جید عالم، مؤرخ، محقق ڈاکٹر طٰہٰ حسین کا معرکہ آرا کارنامہ جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی ذمہ داری کس پر عاید ہوتی ہے۔ قرن اول کی تاریخ کے نازک ترین مرحلہ کی تصویر۔ اپنے موضوع پر لاجواب کتاب کا شگفتہ ترجمہ۔　　قیمت۔ چھ روپے

۲۳۔ جمع القرآن

کیا قرآن کریم کو خود نبی اکرمؐ نے جمع کر دیا تھا یا اسے بعد میں جمع کیا گیا؟ اس سوال کا مختصر لیکن جامع جواب۔　　قیمت:۔ ایک روپیہ

یہ تمام کتابیں

نیز

لاہور سے ہر قسم کی اعلیٰ اور معیاری کتابیں اس پتہ سے منگوائیے

مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷۔بی ۔۔۔ شاہ عالم مارکیٹ ۔۔۔ لاہور

نمل ۔ اور ۔ نملہ

(از محترم مولانا ابوالجلال ندوی)

(سورۂ نمل میں ہے کہ جب حضرت سلیمان اپنے لشکر سمیت وادی النمل میں پہنچے تو وہاں ایک نملہ نے آواز دی کہ اے اہل نمل اپنے اپنے گھروں میں گھس جاؤ۔ (۲۷/۱۸)۔ سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ یہ چیونٹیوں کی وادی تھی اور ایک چیونٹی نے یہ آواز دوسری چیونٹیوں کو دی تھی۔ مولانا ابوالجلال صاحب نے علمی دلائل و شواہد سے اس مضحکہ خیز تفسیر کی تردید کر کے بتایا ہے کہ اس وادی میں آدمی بستے تھے اور یہ آواز وہاں کی ایک عورت نے اپنے اہل قبیلہ کو دی تھی۔ چونکہ یہ بحث قرآن کریم کے اس مقام کو سمجھنے میں مدد دینے کا موجب ہے۔ اس لئے ہم محترم ندوی صاحب کا مقالہ یہ تشکر شائع کر رہے ہیں۔

مولانا ابوالجلال ندوی صاحب طلوع اسلام کی محفل میں پہلی بار تشریف لائے ہیں اس لئے آپ کا مختصر سا تعارف ضروری ہے۔ آپ ضلع اعظم گڈھ (یوپی۔ ہندوستان) کے رہنے والے ہیں۔ اور ندوۃ العلماء (لکھنؤ) کے ۱۹۱۴ء کے فارغ التحصیل۔ آپ کچھ عرصہ دارالمصنفین (اعظم گڈھ) کے رفیق رہے اور پھر ۱۹۳۲ء میں مدراس چلے گئے جہاں آپ جمالیہ عربک کالج سے بہ حیثیت پروفیسر منسلک رہے۔ قرآن اور حدیث کے علاوہ عربی لغت۔ قبیلا لوجی اور تاریخ عرب (قبل بعثت نبوی) آپ کے خاص مضامین ہیں اور ان پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں۔ نیز آپ کا عبرانی بائبل کا مطالعہ بھی بڑا گہرا ہے۔ آپ قرآن کریم کے الفاظ و آیات کی تعبیر و تشریح قرآن پاک ہی سے کرتے ہیں۔ اور احادیث تائیداً لاتے ہیں نہ کہ استدلالاً۔ آج کل آپ کراچی میں قیام فرما ہیں۔ امید ہے کہ قرآن اور تاریخ قدیم کے مشکل مقامات سے متعلق آپ کی علمی تحقیق کے بعض گوشے قارئین طلوع اسلام کے سامنے آتے رہیں گے۔

زیر نظر مقالہ کے ابتدائی حصہ میں آپ نے سورہ شعراء۔ نمل اور قصص کے زمانۂ نزول سے متعلق بڑی سیر حاصل

بحث کی تھی اور ٹھوس دلائل سے بتایا تھا کہ مودودی صاحب کا علم اس باب میں بھی کس قدر سطحی ہے، لیکن ہمیں (گنجائش کی کمی کی وجہ سے) اس حصہ کو حذف کرنا پڑا جس کا ہمیں افسوس ہے۔ ہم محترم مقالہ نگار سے اس عبارت کے لئے معذرت خواہ ہیں۔ اسی طرح مقالہ سے اصل عبرانی کے الفاظ بھی حذف کر دینے پڑے کیونکہ ان کے صحیح نقل کرنے میں دقت تھی اور غلط نقل کرنے سے بہتر تھا کہ انھیں حذف کر دیا جائے۔ اس کے لئے بھی ہم مولانا صاحب سے معذرت خواہ ہیں۔

امید ہے ارباب علم و ذوق اس مقالہ کو بہت مفید پائیں گے۔ طلوع اسلام]

---

(۱) ترجمان القرآن (جلد ۲۔ عدد ۴ صفحہ ۲۰۳ تا صفحہ ۲۱۹) میں مولانا مودودی نے ۲۷ ویں سورہ کی ابتدائی انیس آیتوں کی تفہیم فرمائی ہے۔ اس سورہ میں ایک مقام وادالنمل کا ذکر آتا ہے جس کی وجہ سے اسے سورہ نمل کا نام دیا گیا ہے۔ وادالنمل کا ترجمہ مولانا نے "چیونٹیوں کی وادی" کیا ہے۔ وہ اس ترجمہ میں منفرد نہیں ہیں۔ لیکن ایک جماعت اہل علم کی اس سورہ میں وادالنمل، النمل اور نملہ کا ترجمہ کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔ کیونکہ ترجمہ مطلب ہی کو بدل دیتا ہے۔ مولانا نے اس جماعت پر قرآن کو تاویل کی خراد پر چڑھانے کا الزام لگایا ہے۔ میرے خیال میں اس الزام کے زیادہ مستحق خود مولانا اور ان کے ہم خیال مفسرین ہیں۔ اس لئے مولانا کے دلائل کا جائزہ لینا ضروری ہے۔

(۲) قرآن کریم میں اس سورت سے پہلے شعراء اور اس کے بعد قصص ہے۔ سورۂ شعراء میں خدا نے قرآن پاک کی بابت بتایا ہے کہ وہ تو اگلوں کی زبوروں میں بھی ہے (۲۶/۱۹۶) اور فرمایا کیا ان کے لئے یہ ثبوت کافی نہیں کہ اسے بنو اسرائیل کے اہل علم جانتے ہیں (۲۶/۱۹۷) سورہ نمل میں بتایا کہ یہ قرآن بنو اسرائیل کے لئے اس چیز کا بڑا حصہ بیان کرتا ہے جس (کے حق یا ناحق ہونے) میں وہ باہم اختلاف رکھتے ہیں۔ (۲۷/۷۶) سورہ قصص میں قرآن پاک کی تلاوت سنکر اہل کتاب کے ایک گروہ کے اسلام قبول کرنے کا ذکر ہے (۲۸/۵۲) اس لئے قرآن مجید میں یہ تینوں سورتیں ایک ساتھ رکھی گئی ہیں۔ مولانا مودودی کے نزدیک یہ تینوں سورتیں اسی ترتیب سے مکے کے دور متوسط میں نازل ہوئیں چنانچہ فرماتے ہیں کہ

"مضمون اور انداز بیان مکے کے دور متوسط کی سورتوں سے پوری مشابہت رکھتا ہے اور اس کی تائید روایات سے بھی ہوتی ہے۔ ابن عباس اور جابر بن زید کا بیان ہے کہ پہلے سورہ شعراء اتری پھر النمل پھر القصص۔

(۳) مولانا نے روایت کو اصل حجت کے طور پر نہیں بلکہ تائید کے طور پر پیش کیا ہے۔ سورتوں کی ترتیب نزول قرآن کے متعلق کوئی روایت ایسی نہیں ہے جس کو کتب صحاح میں جگہ مل سکتی۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب التفاسیر کو بھی جگہ دی ہے اس میں ایسی روایتیں نہیں ہیں۔ ان کا معیار تصحیح بہت سخت تھا۔ امام ترمذی تک نے ان روایتوں کو قبول نہیں کیا۔ ترتیب نزول سے متعلق حضرت ابن عباسؓ جابر بن زیدؒ اور حسن بصریؒ وغیرہ کی طرف جو روایتیں منسوب ہیں اتقان میں سیوطی نے ان سب کی سندیں نقل کر دی ہیں۔ افسوس ہے کہ میرے پاس اتقان نہیں ورنہ ان روایتوں کے رجال پر بحث کرتا۔ مجھے ان روایتوں کی صحت اسناد میں شبہ ہے۔ شعراء، قصص اور نمل کی ترتیب

نزول وہ نہیں جو مولانا نے نقل کی ہے اور نہ یہ تینوں سورتیں ایک دور کی ہیں۔ تینوں مختلف ادوار کی سورتیں ہیں، اس کا ثبوت آگے کی سطور میں آپ کو مل جائے گا۔

[چونکہ اس حصے کا تعلق واقعہ نمل سے نہیں اس لئے ہم نے اسے حذف کردیا ہے۔ اگرچہ اس میں بھی صاحب مضمون نے ثابت کیا ہے کہ اس باب میں مودودی صاحب کس قدر غلط سمجھے ہیں۔ طلوع اسلام]

اس سورہ میں جس مقام کا ذکر وادی النمل کے نام سے آیا ہے اس کی وجہ تسمیہ کی بحث سے پہلے اس کے محل وقوع کو متعین کرلینا چاہیئے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

"اس آیت (یعنی ءشا) کو بھی آجکل کے بعض مفسرین نے تاویل کی خراد پر چڑھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وادی النمل سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے بلکہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقہ میں تھی"۔

مولانا نے صاف الفاظ میں اپنی زبان سے یہ بتانے سے قطعی گریز کیا ہے کہ یہ وادی النمل کہاں واقع تھی۔ یہ تو قرآن کو تاویل کی خراد پر چڑھانے والوں کا قول ہوا کہ وہ ایک وادی کا نام ہے جو شام کے علاقہ میں تھی۔ آگے چل کر قرآن کو تاویل کی خراد پر چڑھانے والوں کے اس قول کی تردید کرتے ہوئے کہ "اس سے مراد چیونٹیوں کی وادی نہیں ہے"۔ ان کے قول کی بنیاد بھی تلاش کردی۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

"جن لوگوں نے اسے وادی کا نام قرار دیا ہے انھوں نے خود یہ تصریح کی ہے کہ اسے چیونٹیوں کی کثرت کے باعث یہ نام دیا گیا تھا۔ قتادہؒ اور مقاتلؒ کہتے ہیں وادٍ بارض الشام کثیر النمل، وہ ایک وادی ہے شام میں جہاں چیونٹیاں بہت ہیں"۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود مولانا کا رجحان اس طرف ہے کہ اس سورہ کے اندر مذکور وادی سرزمین شام میں تھی، لیکن یہ بات خود اپنی زبان سے نہیں کہی۔

قتادہؒ اور مقاتلؒ کے قول کو مولانا نے نقل کردیا۔ لیکن اپنے ذریعہ علم کا حوالہ نہیں دیا کہ معلوم ہو کہ ان بزرگوں کی طرف اس کی نسبت کہاں تک درست ہے۔ سیوطی نے درمنثور میں لکھا ہے۔

اخرج ابن ابی حاتم عن قتادہ	ابن ابی حاتم نے جناب قتادہؒ سے نقل کیا ہے کہ
قال ذکر لنا انہ واد بالشام	انھوں نے کہا کہ ہم سے ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ایک وادی ہے شام میں

اس بیان کا مولانا کے بیان سے مقابلہ کیجئے (ذُکِرَ لَنَا) ان کے بیان سے ساقط ہے اور آخر میں (کثیر النمل) کا اضافہ ہے۔ میں مانتا ہوں کہ اس حذف واضافہ کے ذمہ دار مولانا نہیں ہیں۔ انھوں نے کسی کتاب ہی سے بے حوالہ یہ عبارت نقل کی ہوگی۔ لیکن کوئی نہ کوئی ضرور اس حذف واضافہ کا ذمہ دار ہے۔ (کثیر النمل) قتادہ کا قول نہیں ہے بلکہ وہ بعد کے کسی مصنف کا "ادراج" ہے۔ (ذکر لنا) کا حذف اس قول کا ذمہ دار جناب قتادہ کو بنا دیتا ہے۔ حالانکہ وہ کسی اور کا قول نقل کرتے ہیں جس کی بابت نہیں معلوم کہ مومن تھا یا کافر، عادل تھا

یا فاسق، قابلِ اعتماد تھا یا نہیں۔ صیغۂ مجہول اس بات کا قطعی ثبوت تو نہیں مگر عام عادت کے مطابق اس بات کا قرینہ تو ضرور ہے کہ خود قتادہ کو اس قول کی صحت پر پورا وثوق نہیں تھا۔ قتادہ کے مخبر نے ان کو صرف اتنی خبر دی تھی کہ یہ ایک وادی ہے جو شام میں واقع ہے وجہ تسمیہ اس نے نہیں بتائی تھی۔ جناب مقاتل کا قول جس کتاب میں میری نظر سے گذرا ہے بے سند گذرا ہے۔ وادی النمل نام کی کسی جگہ کا جو شام میں واقع ہو جہاں تک میرا علم ہے کسی جغرافیہ نویس نے ذکر نہیں کیا ہے۔ بالفرض شام میں اس نام کی کوئی وادی رہی بھی ہو تب بھی ہم کو یہ غور کرنا ہے کہ قرآن میں مذکور وادی کو اس مقام سے تطبیق دینا جائز ہے یا نہیں۔

ہم نے بتایا ہے کہ اس سورہ کا مقصد ہی بنی اسرائیل کے درمیان ان کے جھگڑے چکانا ہے۔ اس سورہ کی ہر بات ایسی ہے جس کے حق یا ناحق ہونے میں بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف تھا۔ اس سورہ کا ہر مضمون القرآن کے علاوہ ایک اور کتاب مبین[1] میں بھی تھا جس کو بنی اسرائیل کے تمام فرقے نہیں مانتے تھے۔ یہ سب باتیں ہم کو اسی سورہ سے معلوم ہوئیں۔ یہ زید و بکر کا قول نہیں ہے جس کی سند درکار ہوا کرتی ہے۔ یہ کتاب مبین کے اندر اس سورہ کے اندر وارد امور تھے وہ ہمارے پاس نہیں ہے لیکن موجودہ بائیبل سے اس سورہ کے قصے کا مقابلہ کیجئے۔

ملکہ سبا اور حضرت سلیمانؑ کی ملاقات کا ذکر بائیبل میں بھی ہے۔ سفر ملوک کے مؤلف کے بیان کے مطابق وہ حضرت سلیمانؑ کے پایۂ تخت میں آئی تھی۔ "سلیمانؑ کی شہرت سبا کی ملکہ تک پہنچی تو وہ مشکل سوالوں سے اسے آزمانے آئی" (اول ملوک ۱۰:۱) انجیل کے بیان کے مطابق تیمن (جنوب) کی ملکہ زمین کے کنارے سے آئی تھی۔

لِشْمَعَ اِتْ حَکْمَہ شَلُمَہ — سلیمان کی حکمت سننے کو (متی ۱۲:۴۲)

یہ ہے متداول بیبل کا بیان لیکن القرآن اور آیت ۱[1] میں مذکور ایک اور کتاب مبین کے مطابق جواب نابود ہے۔ یہ ملکہ حضرت سلیمانؑ کے پاس ان کے شہر میں نہیں پہنچی تھی بلکہ حضرت سلیمانؑ لاؤ لشکر کے ساتھ وادی نمل میں پہنچے اور یہاں سے چٹھی بھیج کر ملکہ کو بلایا۔ یہ مقام ملکہ کے شہر سبا سے اس قدر قریب تھا کہ اس کے تخت کی بابت ایک عفریت نے کہا "میں اسے لا دوں گا قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں" اور الکتاب کے ایک عالم نے کہا "میں اسے لا دوں گا قبل اس کے کہ آپ کی طرف آپ کی نظر پلٹے"۔ اس لئے قرآن کے اندر مذکور وادی نمل شام کی وہ وادی نہیں ہو سکتی جس کو مولانا کی نقل کی ہوئی روایت کے مطابق یہ نام اس لئے دیا گیا تھا کہ وہاں چیونٹیاں بہت تھیں۔ بلکہ اسے حضرت مسیحؑ کے مقام بیت لحم سے جنوب کی جانب زمین کے کنارے پر واقع ملکہ سبا کے شہر مآرب کے قرب و جوار میں ہونا چاہیئے۔ یعنی بحر ہند کے غربی ساحل کے پاس اس کے شمال میں کسی جگہ۔

مفسر قرطبی نے لکھا ہے کہ جناب قتادہ نے کہا کہ وہ ایک وادی ہے شام میں مگر کعب نے کہا وہ طائف میں ہے۔ خازن اور الشربینی کی تفسیر میں حضرت کعب احبار کا ایک طویل قول منقول ہے جس کا خلاصہ یہ ہے۔

---

[1] ہمارے نزدیک سورۂ نمل کی پہلی آیت میں "کتاب مبین" خود قرآن کریم ہی کی صفت ہے۔ القرآن یعنی کتاب مبین۔ (طلوع اسلام)

حضرت سلیمان علیہ السلام یمن کے ارادے سے چلے۔ اصطخر ہو گئے جہاں مدینۃ النبی صلعم ..... پھر مکہ کر کے گزرے ..... وادی السدیر جو طائف میں ہے گذر کر وادی النمل میں پہنچے۔

کعب احبار تک اس قول کی سند کیسی ہے؟ یہ مجھے نہیں معلوم لیکن اس روایت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ مفسرین کے ایک گروہ کے نزدیک قرآن میں مذکور وادی النمل طائف کی وادی السدیر اور ملکہ سبا کے شہر مآرب کے درمیان ملک یمن میں واقع تھی۔ اگر یہ قول واقعی حضرت کعب کا ہے تو اسے قولِ قتادہ پر ترجیح ہے کیونکہ جناب قتادہ ایک نامعلوم شخص کا بیان نقل کرتے ہیں۔ اپنا ذاتی نہیں کعب احبار اسی دیار کے باشندے تھے جس میں یہ وادی واقع ہے۔ وہ یہودی تھے۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں مسلمان ہوئے۔ اسرائیلیات کے عالم تھے۔ ان کا بیان ایک نہ ایک اسرائیلی روایت پر مبنی ہوگا۔ الشربینی نے اس قول کو نقل کرکے لکھا ہے کہ

ھکذا قال کعب انہ واد بالطائف قال البقاعی وھو الذی یمیل الیہ النفس فانہ معروف عندھم الی الآن بھذا الاسم

کعب نے اسی طرح کہا کہ وہ ایک وادی ہے طائف میں۔ البقاعی نے کہا کہ اسی قول کی طرف طبیعت مائل ہوتی ہے کیونکہ وہ اس آن تک اسی نام سے معروف ہے۔

طائف اور دیار ملکہ سبا کے درمیان والی وادی النمل ملک شام والی زمنی وادی نمل نہیں تھی بلکہ ایک معروف مقام تھا۔

جغرافیہ نویس الہمدانی ۳۳۴ھ نے "صفۃ جزیرۃ العرب" مطبوعہ مطبع السعادہ مصر ۱۹۵۲ء میں سراۃ یعنی اس سلسلۂ جبال کے یمنی حصے بیان کرتے ہوئے جو یمن سے شام تک بحرِ احمر کے کنارے کنارے چلا جاتا ہے۔ اس کے ایک حصے کا ذکر سراۃ المصانع کے نام سے کیا ہے۔ سراۃ المصانع کے ایک پہاڑ کا نام جبل تخلی بتایا ہے۔ اس پہاڑ کے پاس جو بستیاں واقع تھیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ قیلاب، نمل، شرس، ارض ارداں (دیکھو ص۷۱) نوحا شد کے بازاروں کے تذکرہ میں بھی ان مقامات کا ذکر کیا ہے۔ اور یہ سراۃ کے ذکر میں بھی نمل کا تذکرہ کیا ہے (ص۷۲، ص۱۹۳) عجائب یمن کے ذکر میں لکھا ہے

اور ان میں سے ایک جبل تخلی ہے۔ اس میں تین قلعے ہیں اور ..... متعدد بستیاں ہیں، اس کے لئے چند ابواب ہیں جن میں بغیر اجازت کوئی داخل نہیں ہوتا ..... یہ ابواب بند کئے جاتے ہیں ان قلعوں اور بستیوں اور ایسے کھیتوں پر جن سے پانچ ہزار ذہب کا گیہوں حاصل ہوتا ہے جس کی مقدار سات ہزار پانچسو قفیز ہوتی ہے۔ ص۱۹۷

ان ابواب میں سے ایک کا نام البرار بتایا ہے جن سے قدم نمل اور شرس داخل ہوا کرتے تھے۔

یہ مقام آج بھی وادی نمل کے نام سے معروف ہے۔ WALTER B. HARRIS F.R.G.S. نے اپنی کتاب JOURNEY THROUGH THE YEMEN میں ایک نقشہ دیا ہے۔ اس میں صنعاء اور ذمار کے درمیان طول ارض ۳۰ درجہ ۴۴ اور عرض بلد ۶۰ درجہ ۱۴ پر بلاد انیس میں وادی نمل کو دکھایا گیا ہے۔ اس جگہ سے جنوب مشرق میں سات یوم کی مسافت پر شہر مآرب کے آثار واقع ہیں

جس کا ذکر اس سورۃ میں اور سورۃ سبا میں سبا کے نام سے آیا ہے۔ سبا مؤرخوں اور نسابوں کے نزدیک ایک انسانی گروہ کا نام ہے مگر قرآن میں ایک بلدہ طیبہ (سبا) کے نام کی حیثیت سے وارد ہے۔

قرآن کے اندر مذکور وادی نمل سے یہی یمنی وادی مراد ہو سکتی ہے۔ لیکن مولانا مودودی نے اس کی بجائے شام کی ایک وادی سے اسے تطبیق دی ہے۔

مقام کا محل وقوع ایک مفسرانہ روایت، ایک جغرافیہ نویس کی تصریح اور ایک سیاح کی شہادت کے ذریعے آپ نے معلوم کر لیا۔ اب وجہ تسمیہ پر غور کرنا چاہیئے۔ حضرت مولانا مودودی کے نزدیک اس مقام کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہاں چیونٹیاں بکثرت تھیں۔

رہی یہ بات کہ وادی النمل ایک وادی کا نام تھا اور وہاں بنو النمل نام کا کوئی قبیلہ رہتا تھا محض ایک مفروضہ ہے۔ اس کے لئے کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے۔"

معلوم نہیں علمی ثبوت سے کیا مراد ہے؟ مولانا کے پاس غالباً اس کا علمی ثبوت موجود ہوگا کہ شام میں ایک وادی تھی جس میں چیونٹیاں ہی چیونٹیاں بستی تھیں۔ اس کو وادی النمل کہا جاتا تھا۔ حضرت سلیمانؑ نے ایک لشکر جرار جمع کیا جس میں جن تھے۔ انس تھے۔ پرندے تھے اتنا بڑا لشکر لے کر اس وادی پر یلغار بول دی اور اس لئے بول دی کہ چیونٹیوں سے جنگ کریں۔ مولانا کی یہ تفسیر و تفہیم اگر درست ہے تو نعوذ باللہ حضرت سلیمانؑ کو عاقل و بالغ فرمانروا تسلیم کرنا مشکل ہو جائے گا۔ لیکن اگر آپ اس بات کو نہیں مانتے کہ حضرت سلیمانؑ ننھے ننھے بے زبان کیڑوں سے جنگ کرنے کے لئے وادی نمل میں آئے تھے تو آپ پر قرآن مجید کو تاویل کی خراد پر چڑھانے کا گناہ لازم آتا ہے۔ آپ نے اپنی تاویل کی گاڑی چلانے کے لئے ایک من گھڑت بات وضع کر لی ہے۔ اس لئے ڈریئے خدا سے۔ حضرت سلیمانؑ کی فہم و دانش پر حرف آتا ہے تو آنے دیجئے، مولانا کے فہم کے خلاف زبان نہ ہلنے پائے۔ ورنہ آپ تاویلِ قرآن کے مجرم ہوں گے اور آپ ایسی بات کہیں گے جس کا علمی ثبوت موجود نہ ہوگا۔ چیونٹیوں سے لڑنے کو حضرت سلیمان کا وادی نمل میں فوجیں لے کر آنا ایسی بات ہے جس کا علمی ثبوت بھی آپ کو مل سکتا ہے اور عقلی ثبوت بھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(قالت نملۃ) کا ترجمہ مولانا نے کیا ہے "ایک چیونٹی نے کہا" آیت کو "تاویل کی خراد پر چڑھانے والوں" کی زبان سے ترجمہ کیا ہے "ایک نملی نے کہا" حالانکہ وہ بے چارے "ایک نملی" کی بجائے "ایک نملہ نے کہا" ترجمہ کرتے ہیں۔ پھر جناب مولانا "اپنی تاویل کی گاڑی" چلانے والوں پر اعتراض فرماتے ہیں کہ

"یہ بھی ایک ایسی تاویل ہے جس کا قرآن کے الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ اگر بالفرض وادی النمل کو اس وادی کا نام مان لیا جائے اور یہ بھی مان لیا جائے کہ وہاں بنو النمل نام کا کوئی قبیلہ رہتا تھا۔ تب بھی یہ بات عربی زبان کے استعمالات کے خلاف ہے کہ قبیلہ نمل کے ایک فرد کو نملہ کہا جائے..... بنی النمل کے ایک فرد کے متعلق یہ کہنا کہ قالت نملۃ (ایک چیونٹی بولی) عربی محاورہ اور استعمال کے خلاف ہے"

یہ ہے وہ (علمی ثبوت) جس کی بنا پر یہ خیال کرنا واجب ہو جاتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ نے یروشلم سے لاؤ لشکر لے کر چیونٹیوں سے جنگ کرنے

کے لئے سفر کیا تھا۔

مولانا کا یہ بیان صاف اعلان کرتا ہے کہ وادی النمل کسی معین علاقے کا نام نہیں تھا جہاں نمل و شملہ کہلانے والے انسان بستے ہوں۔

مولانا کے استدلال کی ساری عمارت اس خیال پر قائم ہے کہ کوئی عرب قبیلہ کلب کے کسی فرد کے متعلق "قال کلب" نہیں کہے گا۔ قبیلہ اسد کے کسی فرد کی بابت قال اسد نہیں کہے گا۔ لیکن عربی محاوروں کا علم جس قدر مولانا کو حاصل ہے وہ سب بنی امیہ اور بنی عباس کے زمانہ کی عربی سے متعلق ہیں۔ نزول قرآن کے زمانے میں قبائل عرب جو محاورے استعمال کرتے تھے وہ سب محفوظ نہیں ہیں۔ قدیم کتبات کے ذریعے عرب میں بولے جانے والے ایسے الفاظ اور محاوروں کا علم ہو سکتا ہے جن سے ہمارے لغت نویس اور ادبا قطعاً ناواقف ہیں۔ ہم کو ایام جاہلیت کے نہ تمام الفاظ معلوم ہیں اور نہ تمام محاورے۔ قرآن کریم میں (ہیت لك) اور (لات حین مناص) اور (قسمة ضیزی) جیسے فقرے ملیں گے جو قرآن کے علاوہ اور کسی دوسری معلوم اور قدیم عبارت میں نہیں ملیں گے۔ سورۂ نساء کی آیت ۱۶۲ دیکھئے۔ والمقیمین الصلوٰۃ بحالت نصب الراسخون فی العلم اور المومنون پر عطف ہے اور اس کے بعد المؤتون الزکوٰۃ بحالت رفع معطوف ہے۔ قرآن پاک کے علاوہ اور کہیں کسی عربی کلام میں مولانا اس کی نظیر نہیں دکھا سکتے۔ اس لئے ہم مولانا کی محاورہ دانی کی بنا پر قرآن مجید کی کسی آیت کے کھلے اور صریحی مطلب کو نہیں بدل سکتے۔ عربی زبان کے تمام الفاظ، تمام محاوروں، تمام استعمالوں سے تو خلیل و سیبویہ اور فراء بھی واقف نہ تھے۔ مولانا کا علم تو انہوں ہی کا مرہون منت ہے۔

یہ صحیح ہے کہ معلوم و معروف محاورے کے مطابق قال اسد اور قال کلب کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بنو اسد کے قبیلہ کا ایک فرد بولا۔ بنو کلب میں سے ایک نے کہا۔ لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہو سکتا کہ ایک شیر بولا یا ایک کتا بولا۔ اس قسم کا مطلب مراد لینے کے لئے مزید قرائن درکار ہیں۔ قال اسد اور قال کلب کا کھلا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک انسان بولا جسے اسد یا کلب کہا جاتا ہے۔ خواہ اس کا یہی نام ہو، خواہ استعارہ یا کسی اور وجہ سے اسے یہ لقب دیا گیا ہو۔

نملہ ایک صامت اور بے آواز کیڑا ہے۔ کسی انسان نے آج تک کسی چیونٹی کی آواز نہیں سنی۔ چڑیوں کی آوازیں ہم سنتے ہیں اور ایک حد تک ان چہچہوں کی وجہ بھی بعض لوگوں کی سمجھ میں آجاتی ہے۔ بہار میں جس سال زلزلہ آیا تھا اسی سال کا یہ واقعہ ہے کہ موضع بہادر پور پرگنہ نتھو پور، تحصیل گھوسی ضلع اعظم گڑھ کے ایک بوڑھے اہیر یا برہمن نے زلزلہ آنے سے ایک گھنٹہ پیشتر میرے سامنے کسی سے کہا تھا "کاگا بولا۔ دھرتی ڈولی" پھر اس نے میری توجہ اس عجیب حالت کی طرف مبذول کی کہ درختوں پر چڑیاں نظر نہیں آتیں۔

حضرت سلیمانؑ کے قصے میں چڑیا کی بات نقل کرنے سے پیشتر خدا نے ان کو منطق الطیر[1] کے علم سے نوازنے کا ذکر کیا۔ لیکن نملہ کی بات کا ذکر کرنے سے پیشتر منطق النمل کی تعلیم کا ذکر نہیں کیا۔ اس لئے نہیں کہ نمل یعنی چیونٹیاں ناطق جانوروں میں سے نہیں ہیں۔ وہ صامت اور بے آواز کیڑے

---

[1] اس کا دوسرا مفہوم بھی لیا جا سکتا ہے۔ (طلوع اسلام)

ہیں۔ نمل اور نملہ سے مراد چیونٹیاں ہوتیں تو چیونٹی کی بات کے ذکر سے پہلے خدا نے ان کو چیخ کر بولنے کی، حضرت سلیمانؑ کو ان کی بولیاں سننے کی اور ان کی باتیں سمجھنے کی قدرت بخشنے کا ذکر بھی منطق الطیر کی تعلیم کے ذکر کے ساتھ پہلے کر دیا ہوتا۔ نملۃ کے لفظ سے پہلے قالت کا وجود اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ

(۱) یہاں نملہ سے مراد چیونٹی نہیں جو ایک صامت و بے آواز کیڑا ہے۔

(۲) بلکہ یہ کسی ناطق جانور کا وصف یا لقب ہے۔

(۳) اور یہ جانور مؤنث ہے۔

(۴) چونکہ یہ جانور انسان کی طرح بولتا ہے اس لئے اس کو جنسِ بشر ہی سمجھنا چاہیئے۔ یہ قرآن کو تاویل کی خراد پر چڑھانا نہیں ہے بلکہ اس جگہ قالت کے صریح اشارہ کو مسترد کر کے نملہ سے چیونٹی کو مراد بتانا قرآن پاک کو دیومالا کی کتھا بنانا ہے (چیونٹی بولی) ایک شاعر تو کہہ سکتا ہے لیکن اس پیغمبر کی زبان سے یہ بات نہیں نکل سکتی جس کی بابت خدا نے کہا ہے کہ "ہم نے اسے شاعری کی تعلیم نہیں دی اور نہ یہ اس کے لئے زیبا ہے"۔

اس نملہ نے جس کا ذکر ان آیتوں میں وارد ہے سلیمان علیہ السلام کی فوج کو دیکھ کر اپنی جنس کے نروں سے کہا۔

يٰٓاَيُّهَا النَّمْلُ ادْخُلُوْا مَسٰكِنَكُمْ لَا يَحْطِمَنَّكُمْ سُلَيْمٰنُ وَجُنُوْدُهٗ وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ۝

اے نمل! اپنے اپنے گھروں میں جا چھپو، ایسا نہ ہو کہ تم کو سلیمان اور ان کی فوجیں چور چور کر دیں اور ان کو شعور نہ ہو۔

مولانا کے نزدیک یہ بات ایک ناطق اور صاحب عقل عورت نے اپنے ہم جنس مردوں سے نہیں بلکہ ایک صامت و بے آواز مادہ کیڑے نے اپنے بے گوش و ناتواں شنوہم جنسوں سے کہی تھی کیونکہ

"قبیلۂ نمل کے ایک فرد کا بنی النمل کو پکار کر یہ کہنا کہ 'اے نملیو! اپنے گھروں میں گھس جاؤ کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان کے لشکر تم کو کچل ڈالیں اور انھیں خبر نہ ہو' بالکل بے معنی ہے"۔

یہ تو بے معنی ہے لیکن ایک گونگے اور بے آواز کیڑے کا اپنے بے گوش ہم جنسوں کو خلافِ عادت پکار کر اس طرح کی بات کہنا بے معنی نہیں ہے۔ ایک عورت کا اپنی قوم کے سپاہیوں کو ایسا مشورہ دینا بے معنی ہے کیونکہ "انسانوں کے کسی گروہ کو انسانوں کا کوئی لشکر بے خبری میں نہیں کچلا کرتا"۔ لیکن اسے تسلیم کر لینا چاہیئے کہ چیونٹیوں سے لڑنے کو انسانوں، جنات اور طیور کے لشکر ہزار ہا دور دراز سے سفر کر کے ان کو بے خبری میں کچل دیا کرتے ہیں۔ بس ایسی ہی ہوتی ہے وہ "علمی دلیل" جو قرآن کو تاویل کی خراد سے اتار سکتی ہے۔

(لا یشعرون) کا ترجمہ (بے خبری میں) درست نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو شعور تک نہ ہو کہ ان سے کیا خطا سرزد ہو رہی ہے)

حضرت سلیمانؑ کے لشکر جرار کو چیونٹیوں کی بستی پر مولانا جس علمی دلیل سے چڑھا لائے ہیں اس کا دوسرا حصہ مولانا یوں ارشاد فرماتے ہیں کہ "اگر یہ لشکر انسانوں کے علاقے پر حملے کی نیت سے آیا ہوتا تو اسے کہنا چاہیئے تھا کہ اے نملیو! بھاگ چلو۔ پہاڑوں میں پناہ لو تاکہ سلیمانؑ کے لشکر تمہیں تباہ نہ کر دیں۔ گھروں میں گھس جاؤ نہیں کہنا چاہیئے تھا کیونکہ گھروں میں گھسنا لاحاصل ہے۔ حملہ آور اس کے گھروں میں گھس کر اور زیادہ اچھی طرح تباہ کر دیں گے۔" اس دلیل کی بنیاد یہ تصور ہے کہ

(الف) حملہ آور فوج کا دستور ہے کہ ہتھیار پھینک کر گھروں میں گھس جانے والے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کیا کرتی۔ اسے اعتراف شکست نہیں سمجھا کرتی۔ لیکن جنگوں کی تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ یہ تصور غلط ہے (گھروں میں گھس جاؤ) کہنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ مقابلہ مت کرو۔ شکست کو بے مقابلہ تسلیم کرلو۔

(ب) دوسرا تصور یہ ہے کہ "حملہ آور فوج اس دشمن کا پیچھا نہیں کیا کرتی جو خود کو کمزور پاکر پہاڑوں میں جا چھپتا ہے تاکہ موقع پاکر شب خون مار سکے۔" ایسا ہوتا ہے وہ علمی ثبوت جس کی بناء پر سلیمان کو چیونٹیوں سے لڑنے پر آمادہ مان لینا از حد ضروری ہے۔ ورنہ قرآن کو تاویل کی خراد پر چڑھانے کی سزا ملے گی۔

آیت کو تاویل کی خراد پر چڑھانے والوں کا قصور صرف یہ ہے کہ وادی النمل، نملۃ اور النمل کے الفاظ کو ترجمہ میں برقرار رکھتے ہیں پھر بحث و تکرار کے بعد خود بخود وہ مطلب اُجاگر ہو جاتا ہے جس کی صداقت سے مولانا کو انکار ہے۔ اور اس لئے انکار ہے کہ قرآن میں بھی داستان پارینہ جیسی چند باتیں ضرور ہونی چاہئیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ مانیں گے تو ان پر عقل پرستی کا الزام عاید ہو جائے گا۔ اس الزام سے بچنے کے لئے

(۱) ماننا پڑتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ ایک لشکر جرار لے کر ضعیف و بے دم کیڑوں سے لڑنے کو وادالنمل میں آئے۔

(۲) صامت و بے آواز کیڑے کو زور سے چیخنے والا جانور ماننا پڑتا ہے۔

(۳) قالت کے صریح اشارہ کو مسترد کرنا پڑتا ہے۔

(۴) ادخلوا کی تاویل کرنی پڑتی ہے۔ یہ وزن انسانوں سے خطاب کے لئے آتا ہے۔ چیونٹی جیسے کیڑے کی جنس کو مخاطب کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ صیغۂ امر، جمع مذکر استعمال کیا جائے۔ النمل سے مراد چیونٹی کی جنس ہوتی تو صیغۂ امر واحد مؤنث استعمال ہوتا۔ خدا تعالیٰ نے النحل کو مخاطب کر کے کہا ان اتخذی من الجبال بیوتا۔ چونکہ النمل سے ادخلی نہیں کہا گیا اور ادخلن کہا گیا اس لئے معلوم ہوا کہ النمل سے کیڑوں مکوڑوں کی جنس مراد نہیں ہے۔ خازن میں اس کی یوں تاویل کی گئی ہے کہ

ولم یقل ادخلن لانہ جعل لھم عقولا کالادمیین فخوطبوا خطاب الادمیین ۰

ادخلن اس لئے نہیں کہا کہ اس نے ان کے لئے آدمیوں کی سی عقل بنائی۔ اس لئے ان کو آدمیوں کی طرح خطاب کیا گیا۔

ہم کو اس تاویل و توجیہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا کوئی قرینہ موجود نہیں ہے کہ نمل و نملہ سے صامت و بے آواز اور اخرس و بے گویا کیڑے مراد ہیں جن کو خارق عادت طور پر بولنے کی اور حضرت سلیمانؑ کو اس خارق عادت آواز کو سننے اور سمجھنے کی صلاحیت دی گئی تھی۔ النمل کو آدمیوں کی طرح خطاب کیا گیا اس لئے کہ وہ آدمی تھے۔

(۵) نمل اور نملہ سے مراد صامت و بے آواز کیڑے ماننے کی وجہ سے لایحطمنکم کا ترجمہ مولانا نے (لا یطانکم) کے مطابق کیا ہے "کہیں ایسا نہ ہو کہ سلیمان اور اس کے لشکر تمہیں کچل ڈالیں"۔ حطم کا مطلب کچلنا ہرگز نہیں ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ ریزے ریزے کرنا ہے قرآن کریم میں ہے۔

ثم یجعلہ حطاما (زمر ۲۱)	پھر کرتا ہے اسے ریزہ ریزہ (شاہ رفیع الدین)
لو نشاء لجعلناہ حطاما (واقعہ ۶۵)	ہم چاہیں تو اسے ریزہ ریزہ کریں (ایضاً)
ثم یکون حطاما (حدید ۲۰)	پھر ہو جاتی ہے ریزہ ریزہ (ایضاً)

لایحطمنکم کے معنی ہیں "ہو کہ تم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے"۔ یہ بات چیونٹی چیونٹوں سے نہیں کہہ سکتی۔ چیونٹیاں تو خود ریزے ریزے ہوتی ہیں۔ فوجیں ان کو کاٹ کر ریزے ریزے نہیں کیا کرتیں۔ لیکن قرآن کو تاویل کی خراد سے اتار سکنے والی "علمی دلیلیں" جو مولانا کے پاس ہیں ان کے مطابق ہر ناممکن ممکن ہو سکتا ہے۔

صاحب مدارک نے قالت نملۃ کی تفسیر کی ہے۔

(قالت نملۃ) عرجاء تسمی طاخیہ او منذرہ

بولی ایک نملہ لنگڑی جس کا نام طاخیہ یا منذرہ تھا

تفسیر خازن میں ہے۔

(قالت نملۃ) قیل کانت عرجاء وکانت ذات جناحین وقیل اسمھا طاخیہ وقیل جرمی۔

بولی ایک نملہ کہتے ہیں لنگڑی تھی اور دو پروں والی تھی اور کہتے ہیں کہ اس کا نام طاخیہ یا جرمی تھا

ان اقوال پر غور کیجئے ذات جناحین کہنے کی وجہ کوئی روایت یا کہانی نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ اس سورہ میں ہدہد نام کا پرندہ[1] اور ایک نملہ کا ایسا کلام مذکور ہے جو انسانوں کی بات معلوم ہوتا ہے۔ کلام ہدہد کے ذکر سے پہلے خدا نے یہ بتا دیا کہ چڑیوں کی بات سمجھنے کی صلاحیت خارق عادت طور پر سلیمان علیہ السلام کو بخشی گئی تھی مگر یہ نہیں مذکور ہے کہ خارق عادت طور پر نملہ کو بولنے کی طاقت اور حضرت سلیمانؑ کو اس کی خارق عادت بولی سننے اور سمجھنے کی صلاحیت بخشی گئی تھی۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں۔ اس کے

---

[1] ہمارے نزدیک ہدہد بھی پرندہ نہیں تھا۔ (طلوع اسلام)

جواب میں۔

اخرج ابن ابی حاتم عن الشعبی قال النملۃ التی فقہ سلیمان کلامھا کانت من الطیر ذات جناحین ولولا ذلک لم یعرف سلیمان ما یقول۔ اخرج عبد الرزاق وعبد بن حمید وابن المنذر وابن ابی حاتم عن قتادہ قال النمل من الطیر (درمنثور)

ابن ابی حاتم نے امام شعبی سے تخریج کی ہے کہ جس النملۃ کے کلام کو حضرت سلیمانؑ نے سمجھا وہ پرندوں میں سے تھی دو پروں والی۔ ایسا نہ ہوتا تو سلیمان علیہ السلام اس کی بات کو نہ سمجھتے۔ عبدالرزاق، عبد بن حمید، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے قتادہ سے تخریج کی ہے کہ النمل چڑیوں کی جنس سے ہے۔

یہ ہے اس سوال کا جواب کہ خدا نے حضرت سلیمانؑ کو منطق الطیر کا علم دیا تھا۔ نملہ سے مراد اگر چیونٹی تھی تو وہ طیر تو تھی نہیں اس کا کلام حضرت سلیمانؑ نے کیسے سمجھا۔

اس کا نام جرمی جس نے بتایا (اور جس کے مطلب سے میں ناواقف ہوں) اسے منذرہ کا لقب دیا گیا تھا اس لئے کہ اپنی قوم کو اس نے تنبیہ دی تھی کہ ایسا نہ ہو کہ سلیمان کی فوجیں تم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ طاخیہ کہلانے کی وجہ ایک لغت نویس یہ بتاتا ہے۔

تکلم فلان بکلمۃ طخیاء لا یفھم وطاخیۃ فیما ذکر عن الضحاک اسم النملۃ التی اخبر اللہ انھا کلمت سلیمان علیہ السلام۔

ناقابل فہم کلام کو کلمۂ طخیار کہتے ہیں۔ جناب ضحاک کے بیان کے مطابق جس نملہ نے سلیمان علیہ السلام سے بات کی تھی۔ اس کا نام طاخیہ تھا۔

طاخیہ بھی اس النملۃ کا روایتی نام نہیں ہے۔ نملہ کو قسم طیور میں سے بتانے والوں پر اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ بے شک چیونٹی کو بھی پر جم آیا کرتے ہیں، پھر بھی وہ چڑیوں کی طرح چہچہاتی نہیں ہے۔ وہ تو ایک صامت جانور ہے۔ اس کا جواب کسی نے یہ دیا کہ وہ چیونٹی جس کے کلام کو حضرت سلیمانؑ نے سمجھا صامت جانوروں میں سے نہ تھی بلکہ وہ ایک طاخیہ تھی یعنی ناقابل فہم بات بولنے والی ایک جنس کا ایک فرد تھی۔

اس چیونٹی کو جس نے عرجاء بتایا اس کا قول اسے منذرہ، طاخیہ اور جنس طیر سے بتانے والوں کی طرح قیاسی قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً کسی نہ کسی مشہور کہانی سے ماخوذ ہے۔ چیونٹی کو لنگڑی بتانے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی سوائے اس کے کہ قائل اول کے نزدیک وہ نملہ دو یا چار پاؤں پر چلنے والے جانداروں میں سے تھی۔

مولانا مودودی کے "علم کی وسعت اور گہرائی اور قوت استدلال" کو تسلیم کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان کے ترجمہ کی کسی حد تک معقول دلیل صرف یہ ہے کہ جس طرح قال اسد بول کر یہ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ بنو اسد کا ایک فرد بولا اسی طرح قالت نملہ بول کر یہ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ بنو نمل کی ایک عورت بولی۔ اس دلیل کے مقابلہ میں میری دلیل یہ ہے۔

(۱) قال اسد یوں کہ بغیر مزید قرینہ کے یہ مراد نہیں لیا جا سکتا کہ شیر بولا۔

(۲) قال صخر کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ چٹان بولی بلکہ قال کا لفظ قرینہ ہے کہ اسد اور صخر کسی انسان کے نام یا لقب ہیں۔

(۳) ادخلوا جن سے کہا گیا ان کو انسان ہونا چاہیئے۔ النمل سے مراد اگر نحل کی قسم کے کیڑوں کی جنس ہوتی تو اغلباً (دخل) کی طرح (ادخلی) یا عام محاورہ کے مطابق (ادخلن) ہوتا۔

(۴) النمل سے مراد چیونٹے ہوتے تو (لا یحطمنکم) کی جگہ (لا یحطانکم) ہوتا۔

(۵) چیونٹی ایک صامت جانور ہے جب نملہ کو قرآن میں ہم باتیں کرتے دیکھتے ہیں تو یہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں کہ نملہ سے مراد چیونٹی نہیں ہے، بلکہ ایک عورت کا اس لقب سے ذکر کیا گیا ہے۔

"ایک من گھڑت" جسے "اپنی تاویل کی گاڑی چلانے کے لئے" لوگوں نے وضع کر لیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ النمل سے مراد چیونٹے نہیں ہو سکتے بلکہ قرآن کی آیت کو تاویل کی خراد پر چڑھانے کا الزام جن لوگوں پر چسپاں ہوتا ہے وہ مولانا ہی کے ہم خیال ہیں جو قالت نملہ کی من مانی تفسیر کر کے حضرت سلیمانؑ کے لاؤ لشکر کو چیونٹیوں سے لڑنے کے لئے وادی النمل میں چڑھا لاتے ہیں۔

النملہ کا کلام نقل کرنے کے بعد خدا نے فرمایا کہ

فَتَبَسَّمَ ضَاحِكًا مِّنْ قَوْلِهَا وَقَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ ﴿١٩﴾

تب اس کی بات سے ہنستے ہوئے سلیمان مسکرا دیئے اور بولے اے میرے رب مجھے سنبھال تا کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو بخشی ہیں اور یہ کہ میں کوئی بھلائی عمل میں لاؤں جو تجھے پسند ہو اور مجھے اپنی مہربانی سے اپنے بھلے بندوں میں داخل کرے۔

مولانا نے اس دعائے سلیمانی کی تفہیم فرمانے کے بعد لکھا ہے کہ "حضرت سلیمانؑ کی یہ دعا اس موقع پر بالکل بے محل ہو جاتی ہے اگر النمل سے مراد انسانوں کا کوئی قبیلہ لیا جائے اور نملہ کے معنی قبیلہ نمل کے ایک فرد کے لئے جائیں۔ ایک بادشاہ کے لشکر جرار سے ڈر کر کسی انسانی قبیلہ کے ایک فرد کا اپنے قبیلہ کو خطرہ سے خبردار کرنا آخر کون سی ایسی غیر معمولی بات ہے کہ وہ جلیل القدر بادشاہ اس پر خدا سے یہ دعا کرنے لگے۔ البتہ ایک شخص کو اتنی زبردست قوتِ ادراک حاصل ہو کہ وہ دور سے ایک چیونٹی کی آواز بھی سن لے اور اس کا مطلب سمجھ جائے ضرور ایسی بات ہے جس سے آدمی کے غرورِ نفس میں مبتلا ہو جانے کا خطرہ ہو اس صورت میں حضرت سلیمان کی یہ دعا برمحل ہو سکتی ہے"

مولانا نے حضرت سلیمانؑ سے بات کرنے والی نملہ کو ایک صامت و بے آواز کیڑے سے تطبیق دینے کے لئے اپنی قوتِ استدلال کا پورا پہاڑ ہمارے اور آپ کے سروں پر دے مارا ہے۔ لیکن دنیا میں ایسے لوگ بھی ہیں جو ان کے اس کوہِ البرز کو پرِ کاہ سے بھی سبک محسوس کر سکتے ہیں۔ حضرت داؤدؑ کی بابت خدا نے فرمایا (انہ کان عبداً شکورا) داؤدؑ سے یہ شکر گذاری حضرت سلیمانؑ کو میراث ملی تھی۔ وہ شکرِ خدا کا ادنیٰ موقع بھی ضائع نہیں کر سکتے، وہ دعا جس میں خدا کا شکر کیا جائے ہر موقع پر برمحل ہوتی ہے۔ توفیقِ شکر کی دعا کے لئے محل تلاش

کرنے کی، سلیمان علیہ السلام تو پیغمبر تھے ہم جیسے معمولی انسانوں کو بھی ضرورت نہیں۔ ایک ناطق کو بزورِ استدلال ایک صامت جانور سے تطبیق دینے کے لئے مولانا نے جو زورِ بیان استعمال کیا ہے وہ ان کی قابلیت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ لیکن پھر بھی ناکام۔ اس آیت کے مفسر کو وجہ شکر معلوم کرنے کی جدوجہد کے بجائے چند دوسری باتوں پر غور کرنا چاہیئے۔

خدا نے فرمایا فتبسم ضاحکا۔ اس کا ترجمہ تو یہی ہے کہ ہنستے ہوئے مسکرایا۔ لیکن دراصل مطلب یہ ہے کہ "خوش ہو کر مسکرایا"۔ لاؤلشکر لے کر حضرت سلیمانؑ یہاں سیاحی کے لئے نہیں آئے تھے بلکہ یہاں کے باشندوں سے (جن کو مولانا نے اپنے علم کے جادو سے صامت بے آواز، کمزور اور بے دم کیڑے بنا دیا ہے) کسی وجہ سے لڑنے کو آئے تھے۔ لیکن ایک نملہ نے لڑائی نہ ہونے دی۔ اپنی قوم کو رائے دی کہ ہتھیار پھینک کر اپنے گھروں میں جا بیٹھو۔ اس سے آپ خوش ہو گئے۔ کیونکہ مطلب بغیر خونریزی کے پورا ہو گیا۔ قوم نے بے کشت و خون اطاعت قبول کر لی۔ اس لئے آپ خوش ہو کر مسکرائے۔

اس موقع پر حضرت سلیمانؑ نے یہ نہیں کہا کہ شکر ہے خدا کا بلکہ یہ کہا کہ (اوزعنی ان اشکر) مولانا نے ٹھیک ترجمہ کیا ہے کہ (مجھے قابو میں رکھ) اَوْزِعْنِی کے معنی ہیں اسے غلط کاری سے روکا۔ اوزعنی مجھے غلط کاری سے روک۔ اگر اس موقع پر وادی نمل والوں سے جنگ ہو گئی ہوتی تو یہ ایک غلطی ہوتی کیونکہ جس خبر کو سن کر حضرت سلیمانؑ لاؤلشکر لے کر یہاں آئے تھے وہ خبر سبا سے متعلق تھی اور انھوں نے اسے وادی نمل سے متعلق سمجھ لیا تھا۔ نملہ کی بات نے ان کو ارتکاب خطا سے بچا لیا۔ اس لئے دعا کی کہ خدا مجھے قابو میں رکھ تاکہ میں تیرا شکر کیا کروں۔

اس موقع پر حضرت سلیمانؑ نے صرف اس احسان کے لئے شکر کی توفیق نہیں مانگی تھی جو اس نے ان پر کیا تھا بلکہ اس احسان کے شکر کی بھی توفیق مانگی تھی جو اللہ نے ان کی ماں اور باپ پر کیا تھا۔ اس جگہ یہ بات قابلِ غور ہے کہ ماں کا ذکر کیوں؟ خدا نے حضرت سلیمانؑ اور ان کے والد بزرگوار پر بہت سے احسان کئے تھے۔ خاص احسان جو انہی دو کے اوپر تھا وہ منطق الطیر کا علم تھا۔ حضرت سلیمانؑ کی ماں پر خدا نے جو احسان کیا تھا اس کی بدولت انھوں نے ایک طاخیہ کی بات سمجھی جس کا ذکر قرآن میں نملہ کے لفظ سے ہے۔ وادی نمل والوں کی زبان ان کو اپنی ماں سے معلوم ہوئی ہوگی۔ لیکن باتوں میں سب سے زیادہ سچی بات یہ ہے کہ اللہ اعلم بالصواب۔

حضرت سلیمانؑ نے نملہ کی بات سن کر یہ دعا کی تھی کہ مجھے توفیق دے کہ میں کوئی بھلا کام کروں۔ جس سے تو خوش ہو جائے۔ محل کلام خبر دیتا ہے کہ وادی النمل کے باشندوں کے حق میں کوئی بھلا کام کرنے کی حضرت سلیمانؑ نے توفیق مانگی تھی۔ ضرور ہے کہ یہ توفیق ان کو ملی اور وادی النمل کے باشندوں کے لئے انھوں نے کوئی بھلا کام کیا۔ وہ کام کیا تھا؟ وادی النمل کی آثار کاوی کے بعد ہی معلوم ہو سکتا ہے بشرطیکہ معلوم ہو سکے۔

حضرت سلیمانؑ ایک نبی تھے اور ہر نبی پیدائشی طور پر صالح ہوتا ہے۔ اس کے باوجود حضرت سلیمانؑ نے دعا کی کہ مجھے اپنی مہربانی سے صالح بندوں میں داخل کر لے۔ دراصل دعا کا یہ ٹکڑا اسی بات کی بلفظ دیگر تکرار و تائید ہے کہ مجھے کوئی ایسا بھلا کام کرنے کی توفیق دے جس سے تو راضی ہو جائے۔ یہ دعا قبول ہوئی جیسا کہ آگے چل کر دکھایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؑ کو توفیق دی کہ آپؑ نے

ملکہ سبا کو مسلمان کرلیا۔ وادی نمل کے باشندے یا تو پہلے سے مومن ہوں گے یا اس موقع پر انھوں نے بھی اپنے دیار کی عظیم الشان ملکہ کے ساتھ اسلام قبول کرلیا ہوگا۔

مولانا مودودی کا یہ خیال غلط ہے کہ النمل سے بے آواز صامت کیڑوں ہی کے مراد ہونے کی صورت میں حضرت سلیمانؑ کا یہ دعا کرنا برمحل ہو سکتا ہے اور اگر النمل سے مراد انسان ہوتے تو یہ دعا بے محل ہوتی۔ حضرت سلیمانؑ ہرگز انسانوں کے خونِ بیجا سے بچنے کا شکر ادا نہ کرسکتے انسانوں کے حق میں بھلائی کا کلام کرنے کی توفیق نہ مانگتے۔ یہ مولانا کے الفاظ تو نہیں لیکن النمل سے کسی انسانی قبیلہ کو مراد لینے کی صورت میں اس دعائے سلیمانی کو بے محل بتانے کا یہی مطلب ہو سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قرآن پاک میں وارد کسی قصہ کو ناقابلِ یقین پوراتک کتھا میں تبدیل کرنے کی جو بھی کوشش کرے گا وہ ہمیشہ اسی قسم کی غلطی کرے گا جو مولانا سے سرزد ہوئی۔ چیونٹیوں کا بولنا۔ ایک انسان کا چیونٹیوں کی بولی سن لینا پھر اسے سمجھ لینا ایسے خوارق ہیں جن پر یقین کرنے کے لئے مولانا کی قیاس بازی ہی پر اکتفا نہیں کی جاسکتی۔ اس بات کا کوئی علمی ثبوت ہے اور نہ ہو سکتا ہے کہ وادی نمل میں صرف چیونٹیاں ہی بستی تھیں اور چیونٹیوں سے لڑنے حضرت سلیمانؑ یہاں آئے تھے۔ پھر خدا نے صامت و بے آواز کیڑے کو قوتِ گویائی بخش کر حضرت سلیمانؑ کی ساری محنت اکارت کردی۔

مولانا مودودی نے اپنے علم و فضل کا سارا انبار اپنے ناظرین کے دماغوں پر اس مہمل دلا یعنی تفہیم کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے دے پٹکا ہے۔ فرماتے ہیں کہ وادی نمل میں بنو نمل نام کے ایک قبیلہ کا ہونا

> محض ایک مفروضہ ہے جس کے لئے کوئی علمی ثبوت موجود نہیں ہے۔..... تاریخ و جغرافیہ کی کسی کتاب میں اور آثارِ قدیمہ کی کسی تحقیقات میں یہ مذکور نہیں ہے کہ اس وادی میں بنو النمل نامی کوئی قبیلہ بھی بستا تھا۔"

اس دلیرانہ ادعا کے ذریعہ جو تاریخ و جغرافیہ کی ہر کتاب اور آثارِ قدیمہ کی ہر تحقیقات کے علم پر مشتمل ہے۔ مولانا نے عالمانہ احتیاط کا عمدہ نمونہ نہیں پیش کیا ہے۔ مولانا سے پوچھا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید کے علاوہ اور کسی کتاب میں جو قرآن ہی سے استدلال نہ کرتی ہو یہ واقعہ آپ کو ملتا ہے کہ حضرت سلیمانؑ لاؤ لشکر لے کر ایک مقام وادیٔ نمل میں پہنچے جہاں ایک نملہ نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ سلیمانؑ کی فوج آرہی ہے اپنے گھروں میں جا چھپو۔ پھر یہاں سے چٹھی بھیج کر ملکہ سبا کو بلایا۔ وہ آئی اور اس نے اسلام قبول کیا۔ فرمایئے کہ یہ قصہ کسی قدیم جغرافیہ کی کتاب میں، کسی قدیم مؤرخ کے نوشتے میں آثارِ قدیمہ کی کسی تحقیقات میں آپ کو ملا ہے؟ اگر خود یہ قصہ قرآن کے علاوہ کہیں اور نہیں ملا ہے تو پھر مولانا سے اس موقع پر دریافت کیا جاسکتا ہے کہ جناب کو کس جغرافیہ، کس تاریخ، آثارِ قدیمہ کی کس تحقیق میں اس وادی کا سراغ ملا ہے جہاں چیونٹیوں سے جنگ کرنے کو لاؤ لشکر لے کر حضرت سلیمانؑ تشریف لے گئے۔ مولانا جب اپنے خیال کی وادی نمل میں حضرت سلیمانؑ کو چیونٹیوں سے لڑنے کے لئے جانے کا ثبوت کسی جغرافیہ، کسی تاریخ، آثارِ قدیمہ کی کسی تحقیق میں دکھادیں تب ان کو اس اعتراض کا حق پہنچتا ہے کہ اس مقام میں بنو نمل کے آباد ہونے کا کوئی علمی ثبوت نہیں ہے۔

سفرِ تکوین میں ہے کہ قینن نے ایک شہر بسایا اور اس شہر کا نام اپنے بیٹے کے نام کے مطابق حنوک رکھا (تکوین ۴: ۱۷) بیبل میں متعدد اسماء، اشخاص اور قبائل کے ایسے ملیں گے جو جغرافی اسماء بن گئے ہیں۔ زبور ۴۹: ۱۱ کا مؤلف ہم کو قدما کا دستور بتاتا ہے کہ

ان کے دل میں یہ خیال تھا کہ ہمارے گھر ابد تک قائم رہیں گے اور ہمارے مسکن پشت در پشت اس لئے
رہے اپنے نام اپنی زمینوں پر رکھتے تھے۔

اس دستور کے مطابق وادی النمل کے نام کی تشریح کی جاسکتی ہے۔ نمل ایک قوم کا نام ہے جس نے یہ نام اپنی قوم کو عطا کیا۔ وادی نمل اور سوق نمل کا ذکر پہلے گذر چکا ہے۔ یہ مقام یمن میں واقع تھا اور ہے اور آج بھی اسی نام سے معروف ہے۔ یہ مقام ہمدان کے علاقہ میں تھا اور ہے اب ہم کو یہ سوچنا ہے کہ عرب میں اس نام کی کوئی قوم تھی یا نہیں۔ مولانا مودودی کے دماغی کتب خانہ میں اس نام کی کوئی قوم کا ذکر محفوظ نہیں ہے تو نہ ہو۔ قبائل العرب کے مؤلف عمر رضا کحالہ نے القلقشندی کی نہایۃ الارب کے ایک مخطوط نسخہ کے ورق ۱۴ ص ۱ کے حوالہ سے لکھا ہے۔

النمول لبطن من الصبيحيين من ثعلبة طيّ من القحطانية كانت مساكنهم
مع قومهم ثعلبة باطراف مصر مما يلي الشام

نمول بنو قحطان کے قبیلہ ثعلبہ طیّ کی شاخ صبیحیین کے ایک بطن کا نام ہے۔ یہ لوگ ثعلبہ کے ساتھ شام سے ملحق اطراف مصر میں بستے تھے۔

نمول جمع ہے نمل کی۔ یہ قوم اس عہد کی تو نہیں جس کا تذکرہ قرآن میں ہے اور وہاں بستی تھی جہاں کا ذکر وادالنمل کے نام سے وارد ہے۔ لیکن اس سے ظاہر ہے کہ بنو قحطان یعنی جنوبی عرب کے قدماء اپنے افراد کے النمل جیسے نام رکھتے تھے۔ اسی مصنف نے الہمدانی کی اکلیل جزو دہم ص ۱۰۲ کے حوالہ سے لکھا ہے۔

نملا بن قادم لبطن من جحور بن اسلم بن عليان بن زيد بن عريب
بن جشم بن حاشد من همدان.

جحور بن اسلم بن علیان بن زید بن عریب بن جشم بن حاشد کے ایک خاندان کا نام نملا بن قادم ہے۔ یہ بنو ہمدان سے ہیں۔

اس خاندان کی قدامت کا مجھے اندازہ نہیں ہے لیکن بنو حاشد ہی کے علاقہ میں نمل نام کی بستی، بازار اور وادی واقع ہے۔ اسی قسم کی ناموں والی اقوام نے اس وادی کو وادالنمل کا نام عطا کیا تھا۔ جنوبی عرب کی جو قدیم تحریریں اب تک حاصل کی جاچکی ہیں ان میں کوئی تحریر ابھی تک ایسی نہیں ملی ہے جسے وثوق کے ساتھ عہد سلیمان علیہ السلام کی تحریر قرار دیا جاسکے۔ میرے سامنے اس وقت جنوبی عرب کے نوشتے نہیں ہیں اور ان کو جمع کرنے کی صلاحیت سے بھی محروم ہوں کیونکہ موجودہ عہد کی معاشرت نے علمی تحقیقات کو بھی زرداروں کے لئے یا ان لوگوں کے حق میں ضبط کردیا ہے جن کو کسی حکومت کی امداد حاصل ہو۔ مجھے دھندلا سا خیال آتا ہے کہ کسی تحریر کے عکس میں نمل نام کی ایک قوم کا ذکر دیکھ چکا ہوں۔ ممکن ہے یہ خیال صحیح یادداشت پر مبنی ہو۔ اور ممکن ہے کہ میرا خیال مجھے دھوکہ دے رہا ہو۔ جو لوگ جنوبی عرب کے قدیم نوشتوں کو جو اب تک برآمد ہو چکے ہیں جمع کرسکنے کی صلاحیت رکھتے ہوں ان کو بتادینا ضروری ہے کہ اگر یہ نام سبائی

تحریروں میں ملے گا تو ԿԿ1 یا N 18 ی کی صورت میں ملے گا۔ معینی تحریروں میں N 18 ی (ن م ل ہ) کی صورت میں ملے گا۔ نَمْلَتٌ کا لفظ N 18 X 8 (ن ل ت م) کی صورت میں ملے گا۔ کیونکہ جنوبی عرب میں نون تنکیر کی بجائے میم تنکیر مستعمل تھی۔ ہمارے قدماء کا بیان ہے کہ حمیری لوگ لام تعریف کو میم بنا دیتے تھے۔ چنانچہ امن البر الصیام فی السفر کہنے کی بجائے اَمِن مْبِرْ مْصِیَامُ فِی مْسَفر بولتے تھے۔ میری نظر سے ایسا کوئی نوشتہ نہیں گذرا ہے جس میں لام تعریف کی جگہ میم تعریف مستعمل ہوئی ہو۔ سبائی اور معینی تحریروں میں لام تعریف کی بجائے نون تعریف ملتا ہے مگر لفظ کے آخر میں۔ النمل کو سبائی تحریروں میں تلاش کرنا ہو تو 18 ۱۸ (ن م ل ن) کو تلاش کرنا چاہیئے۔ مجھے قطعی امید ہے اس قوم کا کبھی نہ کبھی صنعاء اور ذمار کے درمیان سُراغ مل ہی جائے گا۔

اب آیئے کہ وادی نمل کے باشندوں کی وجہ تسمیہ پر غور کیا جائے۔ عربی زبان میں اس لفظ کا معروف و متبادر مفہوم چیونٹی ہے۔ اس لئے قالت، ادخلوا، لایحطمنکم اور من تولہا کے باوجود لوگوں نے نمل سے چیونٹی ہی کو مراد سمجھا۔ اور ان الفاظ کے معانی و مفاد سے چشم پوشی کر لی۔ اور یہ خیال کر لیا کہ قرآن میں چیونٹی چیونٹے کی کہانی وارد ہے۔ جن لوگوں نے یہ غلطی نہیں کی، نملہ اور نمل کو قالت، قولہا اور ادخلوا کی دلیل سے انسان خیال کیا ان کا بھی یہی خیال ہے کہ جس طرح عرب کے لوگ اپنے افراد کو صخر (چٹان) کلب (کتا) نمر (چیتا) اور یعسوب (شہد کی نرمکھی) نام دیتے تھے۔ اسی طرح نمل بھی ایک مورث کا نام تھا جو بعد میں ایک قوم کا نام بن گیا۔ یہ خیال محض غلط نہیں مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ وادی نمل کے باشندوں کو یہ نام چیونٹی ہی نے مستعار دیا ہو۔ اس جگہ کے باشندے کسی اور وجہ سے نمل کہلاتے ہوں تو ایسا بھی ممکن ہے۔

نزول قرآن کے زمانہ میں عرب میں مختلف عربی زبانیں بولی جاتی تھیں۔ جنوبی عرب کی زبان اور رسم خط کا نام مسند تھا۔ حویل، ورتنی وغیرہ زبانوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ قرآن جس زبان میں اترا اس کا نام مبین ہے۔ یہ زبان بولی تو حجاز میں جاتی تھی مگر پورے عرب میں سمجھی جاتی تھی۔ شام، عراق اور یمن کی عربی اس سے مختلف تھی مگر ان علاقوں کے شعراء جس زبان میں شعر کہتے تھے وہ ان کی مقامی زبان نہیں بلکہ یہی حجازی عربی تھی جس کا نام مبین تھا۔ مبین دراصل بنو اسماعیل کی زبان ہے جو نسلاً عبرانی تھے پھر ان کی زبان میں دیار عرب کی اور زبانوں کے چیدہ چیدہ الفاظ اور محاورے ملے، اور ایک مبین زبان وجود میں آگئی۔ اسمائے اقوام و اماکن کی تشریح کے لئے صرف عربی مبین کے لغت پر اکتفا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے نزول قرآن کے زمانہ تک سولہ سو برس کی مدت گذری۔ اس مدت میں کتنے قدیم الفاظ مر گئے۔ کتنے جدید پیدا ہوئے۔ کتنے الفاظ کے قدیم معانی نسیاً منسیاً ہو گئے۔ اس لئے ہم کو وادی نمل اور نملہ کی حقیقت سمجھنے کے لئے اسی قدر محاورہ دانی پر اکتفا نہیں کرنا چاہیئے جن کے خوش آہند امتزاج کا نام عربی مبین ہے کیونکہ وادی النمل کے نام کی قدامت غالباً عہد سلیمان علیہ السلام تک پہنچتی ہے۔

وادی نمل کا محل وقوع آپ کو معلوم ہو گیا ہے۔ اس علاقہ کا ایک شہر ہجر کہلان تھا۔ جس کے کھنڈروں کے آثار برآمد کئے گئے اور کئے جا رہے ہیں۔ یہی شہر قتبان نام ایک قدیم قوم کا پایہ تخت رہا ہے۔ ۱۱۵ء ق م تک۔ اس کا قدیم نام تمنع تھا۔ یونانیوں

کے زمانے تک یہ شہر اس نام سے مشہور تھا۔ اس بات کا اب پتہ چلا ہے کہ ہجر کہلان ہی یونانی مصنفوں کے بیان کا تمنع ہے۔ جنوبی عرب کے اکثر اماکن کے نام بیبل میں قبائل اور ان کے مورثوں کے نام بن کر ملتے ہیں۔ اس لئے اب سفر ایام دیکھئے۔

بنی اسحاق عیسو اور اسرائیل ۳۴:۱ بنی عیسو الفز ۳۵:۱ بنی الفز تیمن[1]..... اور تمنع ۳۶:۱ اور

جو شیر لوطان ۳۸:۱ اور لوطان کی بہن تمنع (آیت ۳۹:۱ سفر ایام اول باب اول)

ہو سکتا ہے کہ یمنی شہر تمنع کی وجہ تسمیہ میں ان بنو تمنع کا کوئی دخل ہو جن کا ذکر اس بیان میں ہوا ہے۔ اگر اس امکان میں کوئی جان ہے تو وادی نمل کے باشندوں کی وجہ تسمیہ بنو تمنع کی زبان عبرانی سے معلوم ہو گی۔ اس لئے سفر تکوین کی ایک عبارت پڑھیے۔

زات بریتی اشر تشمرو بینی وبینکیم و	یہ ہے میرا میثاق جس کے پابند رہو گے میرے
بین زرعک احریک۔ ہمول لکم	اور تمہارے اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان
کل زکر ونملتم ات لبشر عرلتکم۔	مختون ہو تمہارا ہر نر اور کاٹو تم اپنی شرمگاہ کی
وہیہ لاوت بربت بینی وبینکم	کھال بھی۔ اور ہو یہ ایک نشان میرے تمہارے
	میثاق کا۔ (تکوین ۱۷:۱۱)

یہ ایک عہد تھا جو خدا نے حضرت ابراہیم سے لیا جبکہ وہ ۹۹ برس کے تھے اور حضرت اسمٰعیل ۱۳ برس کے تھے۔ جس دن یہ وعدہ خدا نے لیا اسی دن حضرت ابراہیم نے (تورات کے بیان کے بموجب) اپنا اور اپنے بیٹے کا ختنہ کیا۔

وکلُ اِیشی بیتو یلید بیت و	اور اس کے ساتھ اس کے گھر کے ہر ایک
مقنت کسف مِاَت نکر نملوا	نے خانہ زادوں نے اور غیروں میں سے زرخرید
اِتّوہ (تکوین ۱۷:۲۷)	نے ختنہ کرایا۔

نَمّلُ (اس نے ختنہ کرایا)، یُمُوْلُ (وہ ختنہ کراتا ہے)۔ سے نملہ (مختونہ) اور نمل (مختون) مشتق ہے۔ بنو تمنع یقینی طور پر مختون رہے ہوں گے۔ وادِ النمل میں جو لوگ آباد تھے ان کو مختون یعنی سنت ابراہیمؑ کے پابند ہونے کی وجہ سے نمل اور نملہ کہا جاتا تھا جس نملہ نے حضرت سلیمانؑ کی فوج کو دیکھ کر اپنی قوم سے کہا کہ (گھس جاؤ اپنے اپنے گھروں میں) وہ حضرت سلیمانؑ سے واقف تھی اسی لئے اس نے کہا ہو کہ سلیمان اور ان کی فوجیں تم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ اس نے اپنی قوم کو ایہا النمل کہہ کر پکارا۔ اس طرح اس نے حضرت سلیمان کو خبر دیدی کہ یہ قوم جس سے آپ لڑنے آئے ہیں مختونوں کی قوم ہے ملت ابراہیمؑ والی ہے اس سے جنگ کرنا غلطی ہو گی۔

سورہ نمل کا قصہ نمل اس سورہ کا بنیادی قصہ نہیں ہے۔ اصلی قصہ ملکہ سبا کے مسلمان ہونے کا قصہ ہے جو دراصل جنوبی

---

[1] انجیل کے مطابق قرآن کے اندر مذکور ملکۂ سبا (یمن) کی ملکہ تھی۔ اس لفظ کا ترجمہ اردو میں جنوب کیا گیا ہے حالانکہ یہ انجیلی لفظ عرب کے صوبہ یمن کا نام ہے۔

[2] ہم نے ان مقامات میں اصل عبرانی کے الفاظ نقل نہیں کئے۔ (طلوع اسلام)

عرب کے لوگوں کو جو خود کو بنو سبا کہتے تھے اسلام کی طرف دعوت کی تمہید ہے۔ سبا کا ذکر اس سورہ کے علاوہ سورۂ سبا میں بھی ہے۔ سبا اور ملکہ سبا کے ذکر کو ہم اس موقع پر نہیں پھیلانا چاہتے کیونکہ اس کے لئے ایک طویل مضمون درکار ہوگا۔ میرا مقصود بحث تذکرۂ نمل پر ختم ہو جاتا ہے مضمون طویل ہو گیا ہے مگر خلاصہ مختصر ہے۔

(۱) سورۂ نمل کا زمانہ نزول وہ ہے جب آپ کی دعوت سارے جہانوں کے لئے عام ہو گئی تھی۔

(۲) یہ بنی اسرائیل کے مختلف الخیال گروہوں کے درمیان کا جھگڑا چکانے کو اتری۔

(۳) اس سورہ کا ہر مضمون ایسا ہے جس کے حق یا ناحق ہونے میں بنی اسرائیل کے درمیان اختلاف تھا۔

(۴) اس کے ابتدائی مخاطب اہل مکہ نہیں بلکہ بنی اسرائیل کے مختلف الخیال گروہ ہیں۔

(۵) اس میں سامری وصدوقی وغیرہ فاسق وکافر فرقوں کی تردید کی گئی ہے۔

(۶) یہ سورہ وادالنمل اور ارض سبا یعنی جنوبی عرب والوں کو ملکہ سبا کی عظمت یاد دلاتی ہے اور اس کے اس دین کی طرف جو ملاقات سلیمانؑ کے بعد اختیار کیا تھا دعوت دیتی ہے۔

(۷) وادی نمل میں بسنے والے لوگ نمل اور نملہ کہلاتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ یہ نام ایک صامت و بے آواز کیڑوں کی ایک جنس سے مستعار لیا گیا تھا بلکہ یہ لوگ ملت ابراہیم پر ہونے اور خدا اور ابراہیم کے میثاق کی یادگار کو برقرار رکھنے کی وجہ سے نمل اور نملہ کہلاتے تھے۔

وادی، نمل اور نمل اور نملہ کے ترجمہ کرنے کے بجائے ان لفظوں کو برقرار رکھنے سے جو مطلب ایک شخص سمجھتا ہے وہی درست ہے۔ آیت کو تاویل کی خراد پر اگر چڑھاتے ہیں تو وہ جو بڑی لمبی لمبی اور عالمانہ تقریروں کی شرابیں ہمارے دلوں میں اتار کر ایک صامت و بے آواز کیڑے کو سلیمانؑ کا ہم کلام ثابت کرتے ہیں اور ایک من گھڑت بات کہ (چیونٹی بولی) اپنے جی سے وضع کر کے اپنی تاویل کی گاڑی چلاتے ہیں اور الٹا الزام ان کو دیتے ہیں جو اس کے سوا کچھ نہیں کہتے کہ وادی النمل اور نمل اور نملہ کے الفاظ کو برقرار رکھ کر آیت کا ترجمہ پڑھو پھر اپنے دل سے پوچھو۔ اپنی عقل سے معلوم کرو۔ اپنے فکر سے دریافت کرو کہ حقیقت کیا ہے۔ دوسروں پر الزام لگا کر اپنی باتیں منوانے والے بزرگوں کی سنو تو ضرور مگر خود اپنی عقل و فہم کو بالائے طاق رکھے بغیر۔

رشتہ کی ضرورت

ایک ناکتخدا لڑکی کے لئے موزوں رشتہ کی ضرورت ہے عمر قریب تیس سال صحیح اسلامی ماحول کی تربیت یافتہ۔ اردو۔ فارسی کی عمدہ تعلیم امور خانہ داری اور سلیقہ شعاری سے واقف متوسط شریف (پنجابی) گھرانا۔ داد و دہش کی کوئی شرط نہیں۔

ن ۔ معرفت ادارہ طلوع اسلام ۔۲۵۔ بی گلبرگ۔ لاہور

ایک خط اور اس کا جواب

نواب محسن الملک سید مہدی علی خاں مرحوم کے مجموعۂ مضامین (شائع شدہ تہذیب الاخلاق) میں ایک خط اور اس کا جواب شامل ہے۔ مجموعۂ مضامین میں مکتوب نگار (مظہر الحق) کا تعارف نہیں کرایا گیا لیکن انداز تحریر بتا رہا ہے کہ وہ کوئی بڑے مولوی صاحب ہیں۔ اس خط و کتابت سے اس حقیقت کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے کہ جب کوئی فرد (یا گروہ) قرآن کریم کو علم و بصیرت کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کرتا ہے تو ہمارے قدامت پرست طبقہ کا اس کے خلاف کیا رد عمل ہوتا ہے۔ خط و کتابت پر تاریخیں نہیں دی گئیں لیکن یوں سمجھئے کہ یہ آج سے ساٹھ ستر برس پہلے کی بات ہے۔ امید ہے قارئین اس خط و کتابت کو دلچسپی سے پڑھیں گے۔

خط بنام نواب محسن الملک

مکرمی مولوی مہدی علی صاحب سلمہٗ

اشتیاقیکہ بدیدار تو دارد دلِ من
دل من داند و من دانم و داند دلِ من

آپ کی فصیح و بلیغ تحریروں کو میں نے دیکھا۔ آپ کی استعداد کی کیا تعریف ہو سکے۔ آپ کی لیاقت کا اظہار کون کر سکے۔ مگر نہایت بہتر ہوتا کہ آپ کی تحریریں معقولات اور دنیاوی تہذیب ہی پر ختم ہوتیں اور مذہبی عقائد پر آپ توجہ نہ کرتے۔ بھائی میرے یہ راہ باریک ہے اور رات تاریک۔ ایسی تیزی سے چلنا دانشمندی کے خلاف ہے۔

مہدی مشتاب ایں رہ دین است نہ صحراست
ہشدار کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

بارہ سو برس کی عمارت کو گرانا اور نئی بنیاد ڈالنا اور اسلام کی تصویر مٹانا عقل کے بھی خلاف ہے۔ اگر بے پابندی اسلام کے آپ نیا دین قائم کریں ہم کو کچھ عذر نہیں۔ مگر اسلام اسلام اسلام کی ہمدردی کا جب آپ نام لیتے ہیں تب ہمارے بدن پر لرزہ ہوتا ہے۔ اور تعجب کرتے ہیں کہ کیا اس ہزار برس کے عرصہ میں کوئی بھی اسلام سے واقف نہ ہوا۔ کسی کو حقیقت اسلام کی معلوم نہ ہوئی کہ آپ اس کی اصلاح پر مستعد ہیں۔

پھر اگر بقول آپ کے جو آپنے دوست کو خط میں لکھا ہے عربی عمامہ سر پر ہوتا اور اونچے ٹخنہ کا پائجامہ تو بھی کوئی آپ کی بات سنتا۔ وضع کرسٹانی دعویٰ مسلمانی۔ ہیہات ہیہات۔ شیطان کے وجود سے انکار کرنا۔ شق القمر کا منکر ہونا۔ اجماع کو نہ ماننا۔ کتے کی طرح کھڑے ہو کر موتنا۔ اصحاب کو برا کہنا۔ سلف صالح کو اچھا نہ جاننا۔ مسلمانوں کو پاجی نالائق کہنا۔ اماموں کو صنم و بت بتانا۔ علماء کو مکار دغاباز کہنا ہی اگر نشانیاں اسلام کی ہیں تو سلام ایسے اسلام کو ہے۔

گر ولی این است لعنت بر ولی

حضرت نہ محتسب ہے جس کے دُرہ کا خوف ہو۔ نہ قاضی ہے جس کے فتوے سے دار کا ڈر ہو۔ آزاد گورنمنٹ کی حکومت ہے۔ ورنہ اس آزادی سے بک بک کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی۔ اب تک کب کی آزادی دنیا سے آپ کو حاصل ہو گئی ہوتی۔ آپ کو بڑا ناز مدرسۃ العلوم پر تھا مگر اخبار الاخبار لکھنؤ نے آپ لوگوں کی فریب دہی جو مسلمانوں کو کر رہے تھے ثابت کر دکھایا اور مدرسہ ایمانیہ جاری کر دیا۔ آگرہ اخبار میں بھی آپ لوگوں کی خوب خبر لی۔ کانپور کے مشہور دیندار عالم کے نام سے تو آپ کے بدن پر لرزہ پڑتا ہوگا۔ جبکہ یہاں تک آپ لوگوں کی ذلت کی نوبت پہنچ چکی تو باز نہ رہنا وہی آزادی ہے جس کو سب بے حیائی کہتے ہیں۔ اگر آپ مسلمان نہوں تو آپ اشتہار دیدیں یا مسلمانوں کے عقیدے رکھو ورنہ قیامت کے دن سب حال کھل جاوے گا۔ اور اپنے کئے کو روؤ گے خوب آپ یقین کر لیں نہ اب آپ کا مدرسۃ العلوم چلے گا نہ فریب دہی مسلمانوں کی۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ مذہبی تحریروں سے باز رہیے۔ بدعت کے موجد نہ ہوجیے ورنہ ناحق کوئی جلا ہوا مسلمان کچھ کر بیٹھے تو سب خیر خواہی اسلام کی معلوم ہو۔ جلے ہوئے پھپھولے ہوتے ہیں یہ تو بتاؤ کہ تم کو ان باتوں میں کیا لطف ہے اگر تمھارے خیال دین کی نسبت اچھے رہتے تو تم حقیقت میں بڑے کام کے آدمی تھے لیکن ہم لوگوں کی بدنصیبی ہے کہ تم سے لوگ یوں بگڑے جاتے ہیں۔ والسلام علیٰ من اتبع الھدیٰ۔ فقط
اگر آپ تہذیب الاخلاق میں اس خط کا جواب چھپوادیں گے تو میری نظر سے گزر جاوے گا۔

راقم
مظہر الحق

جواب

سلامے چو الفاظ تو درفشاں
سلامے چو اخلاق تو مشکبو

عرض کرتا ہوں قبول ہو۔ میں نے آپ کا خط پایا، مشکور ہوا۔ آپ کا شکر کیا۔ سبحان اللہ کیا خوب خط لکھا ہے۔ جس کے ہر نقطہ پر دل قربان ہوا جاتا ہے۔

خطت می بینم و گرد سواد نامہ مے گردم   فدائے جنبش آں دست و طرز خامہ مے گردم

آپ نے جو نصیحت مذہبی تحریروں سے باز رہنے کی فرمائی سب سے اول میں اُس کا شکر کرتا ہوں مگر افسوس ہے کہ آپ کی اس آرزو کو پوری نہیں کر سکتا۔ میں نے قرآن مجید میں پڑھا ہے لا تطع المکذبین ودوا لو تدھن فیدھنون۔ اس لئے عزت کی خواہش اور مسلمانوں کی دل جوئی اور طعن و ملامت سے بچانے کی آرزو مجھے سچ کہنے اور حق لکھنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ نہ مداہنت کر کے جھوٹی تعریف کی تمنا میرے دل میں پیدا ہو سکتی ہے۔

بروبکارِ خود اے واعظ ایں چہ فریاد است — مرا فتاد دل از رہ ترا چہ افتاد است
بکام تا نرساند مرا لبش چوں نے — نصیحت ہمہ عالم بگوشِ من باد است

آپ لکھتے ہیں کہ رات تاریک اور راہ باریک۔ تیزی سے چلنا اچھا نہیں۔ میں بھی جانتا ہوں کہ رات تاریک ہے اور راہ باریک لوگوں کو ٹھوکریں کھاتا اور مُنہ کے بل گرتا بھی دیکھتا ہوں اسی واسطے روشنی دکھانے کے لئے جلدی کرتا ہوں تاکہ خدا کے کلام کی روشنی پھیلے اور تاریکی جاتی رہے۔ ڈر تو اس وقت ہوتا کہ بے روشنی کے چلتا۔ بس بھائی میرے۔ اندھاری رات اور تنگ راہ میں بے روشنی کے چلنا دانشمندی سے بعید ہے نہ روشنی دکھانے کے لئے تیزی کرنا۔

آپ لکھتے ہیں کہ تم بارہ سو برس کی عمارت کو گرانا اور اسلام کی تصویر کو مٹانا چاہتے ہو۔ یہ آپ کی لطیفہ گوئی ہے۔ جس کو سن کر آپ کی سی طبیعت والے چند لحظہ قاہ قاہ ہنسیں گے۔ مگر نہ میں بارہ سو برس کی عمارت گراتا ہوں نہ اسلام کی تصویر مٹاتا بلکہ ان بوسیدہ دیواروں اور بدنما جھونپڑیوں کو جو خدا کے اردگرد لوگوں نے ڈال رکھے ہیں اور جس کے سبب سے خدا کی بنائی عمارت کی خوبی چھپ گئی ہے گرانے کی آرزو رکھتا ہوں اور ان تصویروں کو جو لوگوں نے بنا رکھی ہیں مٹانا چاہتا ہوں۔ آپ ہی فرما دیں کہ یہ تصویریں جن کی آپ پرستش کر رہے ہیں خدا کی بنائی ہوئی ہیں یا آپ کو خدا تک پہنچا سکتی ہیں۔ آخر بتائیے تو یہ کیا ہیں ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون۔ اگر یہ تصویریں خدا کی بنائی ہوئی نہیں ہیں تو آپ کیوں ان کو بغل میں لئے پھرتے ہو۔ اور کیوں اسلام کی اصلی تصویر کو مٹاتے ہو۔ کیوں ان بدنما مورتوں سے اپنے دل کے کعبہ کو بتکدہ بنا رکھا ہے۔ ما لکم کیف تصنعون ؂

پھر آپ لکھتے ہیں کہ میں کسی کو متقدمین میں سے اسلام سے واقف نہیں جانتا۔ یہ آپ کی غلطی ہے۔ میرے نزدیک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں اسلام کی خوبیوں کے ظاہر کرنے والے نہ گذرے ہوں اور جنھوں نے تقلیدی اسلام کو بُرا نہ کہا ہو۔ اسی واسطے میں اس بات پر آمادہ ہؤا ہوں کہ آپ لوگوں کو دکھاؤں کہ کتنے لوگ اسلام کی حقیقت جاننے والے گزرے ہیں اور تقلیدی علماً نے ان کی باتوں کو ویسا ہی چھپا رکھا ہے۔ جیسا کہ ابر آفتاب کو چھپا دیتا ہے۔

آپ کا یہ خیال کہ عربی عمامہ اور اونچے ٹخنے کا پائجامہ خلایق سے مطلب نکالنے کا وسیلہ ہے سچ ہے مگر فریب و دغا سے دنیا کمانے کے لئے نہ سچائی و صفائی سے دین کی باتوں کو پھیلانے کے واسطے خیال شیطانی و دعوائے مسلمانی۔ افسوس بریں مسلمانی۔

آپ نے ایک ظرافت کے ساتھ بُرا کہنے سلف صالح کو اچھا نہ جاننے وغیرہ باتوں کو میری طرف منسوب کیا ہے اس لئے مجھے یہ مجبوری کہنا پڑا کہ اَنَا بَرِیْئٌ مِّمَّا تَقُوْلُوْنَ حاشا وکلا۔ کہ میں اصحاب کو بُرا کہتا ہوں یا سلف صالح کو اچھا نہ جانتا ہوں: میں ان کو بزرگان دین اور پیشوایان اسلام سمجھتا ہوں۔ ہاں تمھاری طرح ان کو معصوم و رسول نہیں سمجھتا ہوں۔ سوائے اس بات کے باقی ان کی بزرگی اور پاکی کا ویسا ہی مجھے اقرار ہے جیسا کہ تھا

گوہر مخزن اسرار ہماں است کہ بود! حلقۂ مہر بداں مہر نشاں است کہ بود!
از صبا پرس کہ ما را ہمہ شب تا دم صبح بوئے زلف تو ہماں مونس جاں است کہ بود!

شیطان کے وجود کی نسبت جو آپ نے لکھا ہے وہ بھی صحیح نہیں ہے۔ میں تو اُس کے وجود خارج عن الانسان ہونے سے منکر نہیں۔ سید صاحب گو اس سے منکر ہیں مگر اُس کے وجود حقیقی داخل ہونے سے اور اس کی شیطنت اور اغوا کی تاثیرات سے منکر نہیں۔ پھر ایسی تاویل کرنے والے کو کیا کوئی کافر کہہ سکتا ہے۔ اگر آپ رسالہ تسویہ جو عربی میں ہے اور اس کی شرح جو مُلّا عبدالحلیم نے لکھی ہے ملاحظہ کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اور لوگ بھی وجود خارجی شیطان سے منکر ہو چکے ہیں۔ جن کو نہ کسی نے کافر ٹھیرایا نہ مرتد۔

شق القمر کے انکار پر کفر کا اطلاق کرنا اُس وقت زیبا ہے جبکہ آپ اس معجزے کو متفق علیہ قرار دیں حالانکہ جب بعض مفسرین اس سے منکر ہیں اور بعض محققین بہ دلائل اس کا انکار کرتے ہیں[1] تو شاید آپ کو اس تیزی سے کفر کا کلمہ زبان پر لانا مناسب نہ ہوگا۔ تفہیمات الٰہیہ میں مولوی شاہ عبدالعزیزؒ کے والد نے صاف انکار کیا ہے اور لکھ دیا ہے کہ عندنا لیست من المعجزات۔ حدیثیں جو حضرت ابن عباسؓ سے اس بات میں ہیں اُس پر بھی جرح ہو چکی ہے کہ وہ اس وقت تک پیدا ہی نہ ہوئے تھے۔ حضرت انسؓ کی حدیثوں پر بھی یہی قدح ہو چکی ہے کہ وہ مدینہ میں چار برس کے تھے۔ پس جبکہ علماء میں بحث اس کے منصوص و متواتر ہونے پر ہو رہی ہے تو کفر کا اطلاق کرنا اس کے انکار پر تحقیق سے بے خبری کی دلیل ہے۔ اجماع کو نہ ماننے کو کفر جاننا نادانی ہے۔ ذرا آپ امام احمدؒ کا یہ قول تو مسلم الثبوت میں ملاحظہ فرمایئے کہ من ادعی الاجماع فھو کاذب کہ جس نے اجماع کا دعویٰ کیا وہ جھوٹا ہے اور کسی غیر منصوص مسئلہ میں اجماع اصطلاحی کا دعوے تو ثابت کر دکھایئے وانی لکم ھذا۔ افسوس ان کی سمجھ پر جو چند آدمیوں کی سمجھ کو ایسا قوی جانیں کہ اس کے نہ ماننے کو کفر سمجھیں۔

کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کی نسبت جو آپ نے ایک نامناسب لفظ لکھا ہے غالباً آپ کو افسوس ہوگا جبکہ آپ ترمذی شریف کو ملاحظہ کریں گے کیونکہ اُس کے دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ خود پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت اس کا ہے۔ چنانچہ بال قائما صاف موجود ہے اور پھر محدث موصوف نے اس کی اباحت اکثر محدثین اور عالموں سے منسوب کی ہے۔ یقیناً آپ کو بڑی شرم ہوگی جبکہ آپ کو ان باتوں کا علم ہوگا اور آپ خیال کریں گے کہ جو کلمہ آپ نے لکھا ہے اُس کا اثر کہاں تک پہنچتا ہے۔ اسی لئے

---

[1] بنیادی دلیل یہ ہے کہ قرآن کریم بہ صراحت کہتا ہے کہ رسول اللہ کو قرآن کے علاوہ کوئی اور حسی معجزہ نہیں دیا گیا۔ (طلوع اسلام)

عاقل کو چاہیئے کہ بعد تحقیقات اور علم حاصل کرنے کے زبان سے کوئی بات نکالے تاکہ افسوس و ندامت نہ ہو۔ آپ نے مجھے یہ بھی نصیحت کی ہے کہ یا تو مسلمانوں کے سے عقیدے رکھو یا اسلام چھوڑ دینے کا اشتہار دو۔ سو میں اگر اسلام کو ویسا ہی سمجھتا جیسا کہ آپ سمجھتے ہیں تو ضرور اس کے چھوڑنے کا اشتہار دیتا۔ مگر جبکہ میں اسلام کی سچائی سے میرا دل بھرا ہوا ہے تو اس کے اظہار کا اشتہار دیتا ہوں۔ (طلوع اسلام)

میں نے مانا کہ آپ مجھے فاسد الاعتقاد جانتے ہیں اور تسلیم کیا کہ اور لوگ بھی ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ مگر مجھے تو یقین ہے کہ میں سچا اور پکا مسلمان ہوں علیٰ بصیرۃ من ربی جس دن دلوں کے بھید کھلیں گے جو کچھ ہمارے تمہارے دل میں ہے سب کھل جائے گا۔ اگر آپ کا اسلام آپ کو حوروں کے بوسہ و کنار کا مزہ دے گا جس کی تمنا میں بدن توڑتے اور بھوکے رہتے ہو تو خیر ہم کو بھی امید ہے کہ ہمارا الحاد ہم کو خدا تک پہنچا دے گا جس کے لئے ہم گالیاں کھاتے ہیں۔ طعنے سنتے ہیں اور کافر و ملحد بنتے ہیں۔ اور جس کے شوق میں نہ موتیوں کے مکان کی آرزو ہے نہ شہد و دودھ کی نہروں کی تمنا۔ نہ حوران مہوش کے وصال کا خیال ہے نہ سہی قدان پری پیکر کے آغوش میں لینے کی خواہش[1]۔

بسوز سینہ جنت را بسوزم
بآب دیدہ آتش را دہم نم

آپ نے جو یہ لکھا ہے کہ نہ محتسب ہے جس کے دُرّہ کا خوف ہو۔ نہ قاضی جس کے فتوے سے دار کا ڈر ہو۔ بلاشک سچ لکھا ہے لیکن کیا آپ کے جگر خراش طعنے محتسب کے دُرّہ سے اور آپ کی دل سوز ملامتیں دار کے کھینچنے سے کم ہیں۔

آنچہ زخم زبان کند بامرد
زخم شمشیر جانستاں نہ کند

پس جبکہ ہمارا جوش و ولولہ اس خوف سے کم نہ ہوا۔ اور ہمارے دل کی شعلہ زن آگ آپ کی ملامت نہ بجھا سکی تو محتسب کا دُرّہ کیا کرتا اور قاضی کے فتوے سے کیا ہوتا اگر دار پر بھی کھینچے جاتے تو یہی کہتے۔ کہ

بجرم عشق تو ام مے کشد کہ غوغائیست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشائیست

آپ نے مدرسۃ العلوم کی نسبت جو لکھا اس سے مجھے بڑی خوشی ہوئی بلاشبہ لکھنؤ کے اخبار الاخبار نے ہماری فریب دہی ثابت کر دی۔ اگرچہ اخبار نے بھی ہم کو ملحد ٹھہرایا۔ اور مدرسۃ العلوم کا چندہ بند ہو گیا۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ وہ لوگ یہ سن کر مر نہ جاویں کہ قریب اسی ہزار کے چندہ ہو چکا ہے اور ابتدائی مدرسوں کے تقرر کے لئے جا بجا سے درخواستیں چلی آتی ہیں۔ اور اب چند روز میں شاخیں

---

[1] اس سے نعمائے جنت کا انکار مقصود نہیں بلکہ جنت اُخروی کی اُس مادی تعبیر کا انکار مقصود ہے جس کی تشریحات سے ہماری کتب تفاسیر بھری پڑی ہیں اور جو مخالفین اسلام کے لئے سینکڑوں اعتراضات کا مسالہ بہم پہنچاتی ہیں۔ (طلوع اسلام)

ان مدارس ابتدائی کی جو رسمی مدرستہ العلوم کی ہیں جا بجا قائم ہوا چاہتی ہیں۔ ہاں ایک بات کا مجھے بھی افسوس ہے کہ مدرسہ ایمانیہ کی سی تعلیم ان الحادی مدرسوں میں نہ ہوگی۔ وہ عاقلانہ خیالات جو اس تعلیم سے پیدا ہوتے ہیں، ان مدرسوں کے تعلیم یافتہ آدمیوں کو نہ ہوں گے۔ میں نے ابھی تھوڑے دن ہوئے مدرسہ ایمانیہ کے اخبار الاخبار میں ایک بڑے مفتی و مجتہد علامی فہامی کا محققانہ قول دیکھا تھا کہ انھوں نے بوم یعنی اُلو کی نسبت لکھا تھا کہ اخبار صحیحہ سے ثابت ہے کہ بوم اول بستی میں رہتا تھا۔ جب سے امام علیہ السلام شہید ہوئے۔ اُس نے ویرانہ میں رہنا اختیار کیا۔ دن کو روزہ رکھتا ہے شام کو قوت مالا یموت پر افطار کرتا ہے۔ رات بھر امام کے غم میں مرثیہ پڑھتا ہے۔ نعوذ باللہ من ھذہ الھفوات۔

پس ایسے عالی دماغوں کے دلوں پر مدرستہ العلوم کے مقرر ہونے کا داغ کیوں نہ ہو۔ اس لئے کہ ایسے نازک خیال والے اس تعلیم کے بعد کہاں دکھائی دیں گے۔ اور ایسے اُلو کی حقیقت بتانے والے کہاں باقی رہیں گے؟ آگرہ اخبار نے بھی اپنی محبت اسلامی کے ظاہر کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ ایسے لوگوں کے حق میں سوائے یا لیت قومی یعلمون کے اور کیا کہا جاوے۔ افسوس ان مسلمانوں پر کہ آنکھ رکھتے ہوں اور نہ دیکھیں۔ کان بھی ہوں مگر کچھ نہ سنیں، دل بھی پہلو میں ہو مگر کچھ نہ سوچیں ؎

چشم باز و گوش باز ایں ذکا
خیرہ ام در چشم بندی خدا

مِعراجِ انسانیت

رسُول کریم کی سیرتِ طیبہ قرآنی آئینہ میں

صفحات ۸۳۲ بڑی تقطیع مجلد مع گرد پوش و بکس

قیمت:- بیس روپے۔ رعایتی۔ پندرہ روپے

ملنے کا پتہ:- مکتبہ طلوعِ اسلام

۲۷- بی — شاہ عالم مارکیٹ — لاہور

This page is already at No 9
Page 65 is not printed

سرسیّد احمد خاںؒ

عظمتِ رفتہ کا داعی ——— اور ——— نشاۃِ ثانیہ کا نقیبؒ

(از محترم صفدر سلیمی صاحب)

گذشتہ ایک صدی سے ہماری ملّت نے (ہندوستان و پاکستان میں) زندگی کے مختلف شعبوں میں جو ارتقائی مراحل طے کئے ہیں اگر ان کا بغور جائزہ لیا جائے تو سرسیّدؒ کی شخصیت ان سب کا اولین محرک دکھائی دے گی۔ اندازہ لگائیے کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد کے دور میں جسے ہماری ذلّ و مسکنت اور زوال و انحطاط کا نازک ترین دور کہا جاتا ہے سرسیّدؒ قوم کو موت سے بچانے کے لئے اٹھا۔ اُسے اس راہ میں بیک وقت برطانوی ملوکیت، ہندو کانگریس اور خود اپنی ہی قوم کے مذہبی اجارہ داروں کی شدید ترین مخالفت میں اپنے پیشِ نظر مقصد کی کٹھن منزلیں طے کرنی پڑیں اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو سرزمینِ ملت پر ان ننھے ننھے پودوں نے سر اُبھارنا شروع کر دیا تھا جو بالآخر گلکدۂ پاکستان پر منتج ہوئے۔

یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ ہماری نشاۃِ ثانیہ کے نئے دور میں ابھی تک سرسیّدؒ کے مقام کو کماحقہٗ اہمیت نہیں دی گئی۔ اسی احساس کے بنا پر طلوعِ اسلام میں محترم صفدر سلیمی صاحب کے قلم سے حیاتِ سرسیّدؒ کے موضوع پر یہ سلسلۂ مضامین شروع ہو رہا ہے۔

زیرِ اشاعت مضمون میں سرسیّدؒ کی شخصیت کو من حیث المجموع روشنی میں لایا گیا ہے۔ آئندہ اشاعتوں میں ان کی زندگی کے مختلف اور اہم گوشے الگ الگ قارئین کے سامنے آتے رہیں گے۔ امید ہے کہ سرسیّدؒ کی یہ تاریخی تفاصیل قارئینِ طلوعِ اسلام کو ہماری نشاۃِ ثانیہ کے اس "طائرِ پیش رس" کے اُن گرانقدر کارناموں سے متعارف کرا سکیں گی جو اس نے ہماری ملت کو موت سے بچانے اور عروج و اقبال کی طرف لے جانے کے لئے پورے عزم و استقلال کے ساتھ سرانجام دیئے۔ (طلوعِ اسلام)

———×———

This page is already at No10
Page 66 is not printed

آزادی اور استقلال کی متاعِ بے بہا سے مالامال ہو کر آج ہم آزاد قوموں کی صف میں کھڑے ہیں لیکن ـــــ ٹھیک ایک صدی قبل ـــــ تصور میں لایئے تاریخ کا وہ دلدوز و جگر سوز منظر جب ماضی کے ہر بیش بہا سرمائے کو سرِ بازار لٹ کر ہماری ملت، مایوسی اور شکست کی ماتم سرا میں پے در پے زخموں سے نڈھال دم توڑ رہی تھی۔ یہی ملت تھی جس کے پیش رو عروج و اقبال اور فتمندیوں کے پرچم اڑاتے سعادت و رش کے کاشانوں میں داخل ہوئے تھے۔ اور پھر صدیوں تک اپنی عظمت اور جاہ و جلال کے درخشندہ اور گہرے نقوش ثبت کرنے کے بعد اس نے ذہنی افلاس، معاشی بے چارگی اور سیاسی زوال کے خرابوں سے گذر کر موت کے ویرانوں کا رُخ کر لیا۔ اس کے قلب و نظر کی تابناکیوں پر درماندگی اور جمود کا گرد و غبار چھا گیا۔ اس کی زندگی کی نبضیں ڈوبنے لگیں اور وہ نازک گھڑی قریب تھی کہ اس جرم ضعیفی کی سزا میں قاضیٔ تقدیر کی بارگاہ سے اس کی موت کا فیصلہ صادر ہو جائے۔

عین اس وقت جبکہ پردۂ افلاک سے ہماری زندگی کا یہ سب سے اندوہناک حادثہ برپا ہوا چاہتا تھا۔ قومی زندگی کے ایک نامعلوم اور غیر معروف گوشے سے سرسید علیہ الرحمتہ ایسا گرانمایہ زعیم صبح امید کا ستارہ بن کر نمودار ہوا۔ اور اس نازک اور کڑے مرحلہ پر ملت بیچارگاں کا قافلہ سالار بن کر عرصۂ کارزار میں مردانہ وار کود پڑا۔ یہ جرأتِ رندانہ کس قدر صبر آزما ثابت ہوئی اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ جہاں سرسید کو سیلابِ بلا کی بپھری ہوئی موجوں سے نبرد آزما ہونا پڑا وہاں اپنی ہی اُس کشتی کے مسافر اُس کے دشمن جان بن کر مقابلے میں آ گئے جسے بچانے کے لئے اس نے جان کی بازی لگائی تھی۔ بے گانوں سے بڑھ کر یگانوں کی کرم فرمائیاں تھیں جو کبھی اس کے پائے استقلال کے لئے نوکیلے کانٹے بنیں اور کبھی دشمنوں کے ہاتھ کی تلوار ثابت ہوئیں۔ لیکن خدا کی ہزاروں رحمتیں ہوں اُس "دیوانے" پر جس کی دیوانگی نے بالآخر سب کو مات دی۔ اس کا جذبۂ صادق، اس کا عزم و استقلال، اس کا خلوص و ایثار اور جوش کردار جذب و مستی کے والہانہ کیف میں تمام موانعات کو زیر و زبر کرتے چلے گئے۔ مخالفت کی تند و تیز آندھیاں اُس کے عزم صمیم کو غبار آلود نہ کر سکیں۔ بغض و عناد کے شعلے اُس کے جذب و مستی کی مسکراہٹیں نہ چھین سکے۔ حوادث کی بجلیاں اُس کے ولولوں کو شکست نہ دے سکیں۔ مصائب و آلام کی تاریکیوں میں اُس کے خلوص و ایثار کی آب و تاب ماند نہیں پڑی۔ اپنی محبوب ملت کی نشاۃِ ثانیہ اور عروج و اقبال کی بازآفرینی کے لئے وہ ہر دشمنِ ملت سے ٹکرایا۔ برادرانِ وطن سے لڑا۔ برطانوی سامراج کے مغرور اور اکڑباز نمائندوں سے لڑا۔ مذہب اور شریعت کے بزعم خود غلط اجارہ داروں سے لڑا۔ ایک سرسید کی تنہا جان تھی جو قوم کو موت کے چنگل سے بچانے کے لئے ایک ایک محاذ پر جو مکھی جنگ لڑ رہی تھی۔ وہ زندگی کے آخری سانس اور خون کے آخری قطرہ تک ہر محاذ پر مردانہ وار لڑتا رہا اور بالآخر زخموں سے چور چور ہو کر گرا۔ دم مرگ اس کے چہرے پر ایک کامیاب زعیم اور کامران قافلہ سالار کی سنجیدہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ یہ مسکراہٹ اُس کی بے مثال فتحمندیوں کا نشان تھی۔ وہ اپنی کشتی کو بھنور سے بچا کر اس کا رُخ ساحلِ مراد کی جانب پھیر چکا تھا اور اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کے لئے اس نیا کے سینکڑوں کھیون ہار اب ایک دوسرے سے آگے بڑھ رہے تھے ـــــ اور یہی ہے ایک قافلہ سالار کی فتحمندیوں کی دلیل جسے کاتبِ ازل نے سرسید کی قسمت میں لکھ دیا تھا۔ سرسید اس جہانِ رنگ و بو سے رخصت ہو گیا لیکن اس نمودِ سحر کے امکانات روشن کر گیا جو بالآخر مملکتِ پاکستان کی تشکیل سے فضائے عالم میں ضوفشاں اور جلوہ بار ہوئی۔ اُس کے فکر و عمل کا عظیم ترین شاہکار، دارالعلوم علی گڑھ کی صورت میں دنیا کے سامنے آیا۔ اور آج کون ہے جو اس حقیقت سے

This page is already at No11
Page 67 is not printed

انکار کرسکے کہ ملت کے نونہالوں کی یہی وہ مرکزی تربیت گاہ تھی جس نے خاک کے ذروں کو ستاروں کی تابانیاں سکھائیں۔ سرسیدؒ کی معجز نمائیوں کا یہ سلسلۂ دراز تاریخ کا ایک سنہری ورق بن چکا ہے اور قوموں کی بگڑی بنانے کے سلسلہ میں یہ ہمیشہ ایک نشانِ راہ (LAND-MARK) کا کام دے گا۔

سرسیدؒ کی زندگی اور زندگی کی تگ و تاز اس حقیقت کی آئینہ دار ہے کہ قیادت کے میدان میں وہ ایک جامع صفات شخصیت ثابت ہوئے۔ قومی خدمت اور قیادت کا کوئی شعبہ نہیں جس میں انہوں نے اپنی ملت کے لئے ایک نئی شاہراہ نہ کھول دی ہو۔ فکر و عمل کا کوئی میدان نہیں جہاں وہ اپنے معصروں میں سب سے ممتاز اور سرفراز نظر آتا ہو۔ پیشتر اس کے کہ ہم سرسیدؒ کی عظمت کے مختلف گوشوں کو سامنے لائیں اس سلسلہ میں ایک اہم نقطہ کی وضاحت ضروری ہے۔

آج ایک صدی کے بعد ماضی کے دھندلکوں سے سرسیدؒ کی عظمت کے نقوش کو ان کے حقیقی رنگ و روغن کی آب و تاب میں جانچنا غیر معمولی دقتِ نظر کا محتاج ہے۔ ان کے مکتبِ فکر سے اختلاف یا کسی دوسرے سطحی نقطۂ نظر کی بنا پر آج یہ کہنا بڑا آسان ہے کہ سرسید کے فکری و عملی کارناموں میں کوئی مخصوص امتیازی شان نظر نہیں آتی۔ یا یہ کہ انھوں نے فلاں معاملہ میں غلط قدم اٹھایا، فلاں مقام پر یوں ٹھوکر کھائی اور فلاں جگہ یہ فنی غلطی کی۔ سرسیدؒ کے نقاد یہ کہتے ہوئے اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ سرسید کی شخصیت عصرِ حاضر کے کسی قائد کی شخصیت نہیں بلکہ اس کی عظمتِ کردار کا رابطہ ایک صدی قبل کے عہدِ رفتہ اور زوال پذیر قومی ماحول سے وابستہ ہے۔ اس ایک صدی میں ہم سینکڑوں کٹھن منازل اور ارتقائی مراحل سے گذر کر نئی منزل تک پہنچے ہیں۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمارے آج کے قافلۂ بہار کا طائرِ پیش رس تھا لیکن سوچئے تو سہی کہ جس فضا میں وہ سرگرم پرواز ہوا اس میں صبح بہار کی کوئی شرمائی سی کرن بھی نظر آسکتی تھی؟ کیا ملت کے اجڑے ہوئے چمنستانوں میں خزاں کے سوا کچھ اور دکھائی دیتا تھا؟ اور کیا اس خزاں کی عمر دراز صدیوں تک پھیلی ہوئی نہیں تھی؟ کسی رجلِ عظیم کی عظمت کو کسی دوسرے دَور کے معیاروں پر پرکھنا مناسب اور درست نہیں ہوتا۔ دیکھنا یہی پڑے گا کہ اس نے کس ماحول میں آنکھ کھولی اور جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو اپنے پیچھے اُس ماحول کو کس انقلاب سے آشنا کر گیا۔ گردشِ ایام کبھی ماضی کی طرف نہیں پلٹ سکتی۔ لیکن وہ اکثر اوقات ماضی کے کارناموں کو گرد و غبار کے سپرد ضرور کر دیتی ہے حسنِ نیت اور انصاف کا تقاضا ہے کہ سرسید کے معاملہ میں بھی اس اصول کو نظر انداز نہ کیا جائے۔ اس زعیمِ ملت کی عظمت یا تو تاریخ کے ان مستقل پیمانوں اور معیاروں سے جانچی جائے گی جن سے ہر دور کا زعیم ماپا اور تولا جاتا ہے اور پھر اس کے اپنے دور اور ماحول کے ترازوؤں سے۔ اور یہ دونوں پیمانے اور معیار علی رؤس الاشہاد بتائیں گے کہ سرسیدؒ کس قدر عظیم المرتبت قائد ثابت ہوا۔ وہ اپنے عزائم میں کس قدر مخلص اور صاحبِ ایثار تھا۔ اور کس قدر درخشندہ و تابندہ بلکہ لازوال ہیں اس کی کامیابی و کامرانی کے وہ نقوش جو اس کی طبعی موت کے بعد اس کی غیر فانی عظمت کا نشان بن گئے۔ ترکی کی شہرہ آفاق خالدہ ادیب خانم نے کس قدر درست کہا تھا:-

"سرسید کو کسی پہلو سے بھی دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا بھاری پتھر تھا جو ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لڑھکا دیا گیا اور اس نے جو لہریں برپا کی وہ آج تک برابر

This page is already at No12
Page 68 is not printed

حرکت میں ہیں خواہ وہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جسے سرسید پسند کرتے۔ (حیاتِ جاوید)

جب ہم اس عظیم و جلیل قائد کی زندگی کے اوراق الٹتے ہیں تو شروع ہی میں ہم دیکھتے ہیں کہ سرسیدؒ ایک عام متوسط الحال گھرانے میں پیدا ہوئے۔ یہ درست ہے کہ ان کے والدِ بزرگوار کا تعلق دربارِ مغلیہ سے تھا لیکن انیسویں صدی کے ان ایام میں مغلوں اور ان کے دربار کی بھلا حیثیت ہی کیا باقی تھی۔ اور لال قلعہ کی سنگین دیواروں سے باہر اس نام نہاد دربار کا دولت و اقتدار سے واسطہ ہی کیا رہ گیا تھا۔ مزید برآں یہ بھی ہوا کہ والدِ مرحوم کی وفات کے بعد سرسیدؒ اور ان کے خاندان کی گذر اوقات تک کی کوئی صورت نہ رہی۔ اس وقت سرسیدؒ نے بمشکل ابھی عالمِ شباب میں قدم رکھا ہی تھا کہ معاشی ذمہ داریوں کی بناء پر صدر امینی میں ایک معمولی سررشتہ دار کی حیثیت سے ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ یہ سرسید کی زندگی کا حرفِ آغاز تھا۔ پھر وہ اپنی خداداد قابلیت سے منصفی؛ سول ججی اور صدر امینی کے مناصب سے آگے بڑھتے ہوئے وائسرائے ہند کی لیجسلیٹو کونسل کی رکنیت تک پہنچے۔ اور بالآخر سب سے بالاتر ہو کر قومی خدمت اور دار العلوم کے لئے وقف ہو گئے۔

بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ سرسیدؒ کی زندگی کا یہ حصہ ایک جداگانہ اور انفرادی حیثیت رکھتا ہے اور نہ تو یہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے متعلق ہے اور نہ ہی سرسیدؒ کی قائدانہ عظمت کے سلسلے میں ہم اسے بطور دلیل پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ اس نادرِ روزگار زعیم کی تربیت اسی ماحول میں ہوئی۔ نوکرشاہی کی اسی سرزمین سے وہ چشمہ پھوٹا جس نے ملت کے اجڑے ہوئے کشتِ زارِ سعی و عمل میں شادابیاں پیدا کر دیں۔ ملازمت کی اسی راکھ سے وہ شعلہ بھڑکا جس نے ہماری بے حسی اور جمود کے خرمنوں میں زندگی، حرکت اور عمل کی آگ کو جنم دیا۔ یہی تو وہ زندگی بخش معجزہ ہے کہ دفتری نظام کے جن سرد خانوں میں رگِ زندگی کی تپش مُردہ پڑ جاتی ہے سرسیدؒ وہاں سے پُرسوز زندگی کی بجلیاں لئے نمودار ہوا اور ملک کے طول و عرض میں سکوں سوز ہنگامے بکھیر گیا۔ اپنی زندگی کے اسی دور کا ذکر کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

> اپنی قوم کے لئے میں نے دور دراز کے سفر اختیار کئے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب کبھی کہیں میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی ہے۔ جب کبھی میں نے مہذب اور صاحبِ علم انسانوں کی مجلسیں دیکھیں۔ جہاں کہیں عمدہ عمارتیں اور شگفتہ پھول نظر آئے۔ یہاں تک کہ جب کبھی کسی خوبصورت شخص کو دیکھا، مجھے ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور رنجیدہ ہو کر بے ساختہ کہا کہ ہائے! ہماری قوم ایسی کیوں نہیں؟

(حیاتِ جاوید)

ان چند الفاظ میں سرسیدؒ نے اپنے دل کی دھڑکنوں اور جگر کے زخموں کو ہمارے سامنے واشگاف کر کے رکھ دیا ہے۔ کس قدر تند و تیز شعلے تھے جو اس کے قلبِ دلفگار کی پہنائیوں میں سلگ رہے تھے۔

سرسیدؒ کے خلاف ان کے مخالفین کا سب سے بڑا الزام یہ ہے کہ وہ ساری زندگی برطانوی سامراج سے دوستی اور رفاقت کا حق ادا کرتے رہے اور اپنی قوم کو بھی اس کے خلاف نبرد آزما ہونے سے باز رکھا۔ وہ قوم جو زندگی کی صلاحیتوں سے بے نصیب اور حقائق سے روگرداں ہو کر مدت سے جذبات کی رَو میں بہتی چلی آ رہی ہے اسکے گرمجوش حلقوں سے اس قسم کا الزام بعید از قیاس نہیں لیکن تاریخ کے

This page is already at No13
Page69 is not printed

ان حقائق کی روشنی میں ذرا سنجیدگی سے سوچئے کہ اگر سرسید اعتدال کی اس راہ کو اختیار نہ کرتے تو ہمارا حشر کیا ہوتا؟ سرسیدؒ کی عقابی نگاہوں نے بخوبی بھانپ لیا تھا کہ مسلسل آرام کوشیوں اور عیاشیوں کے باعث جس قوم نے اپنی صدیوں کی سلطنت کے ساتھ زندگی کی ہر متاعِ عزیز تک کو بھی ہار دیا اس کا نئے حکمرانوں سے جو پہلے ہی جوشِ انتقام میں اُس کی رگِ حیات کاٹ دینے پر تلے بیٹھے تھے، لڑائی مول لینا موت اور خودکشی کو دعوت دینے سے کم نہیں۔ برادرانِ وطن ان طاقتور حکمرانوں سے محبت کی پینگیں بڑھا کر نوکرشاہی کے دفتری نظام میں ان کے دست و بازو بن رہے تھے اور دونوں کی ملی بھگت سے ایسی سازش بروئے کار آ چکی تھی جو زندگی، عزت اور آبرو کے ہر میدان سے مسلمانوں کو ختم کرنے کے درپے تھی۔ قومی ہلاکت کی اس فضا میں انسانی فراست کا یہ کتنا بڑا معجزہ ہے کہ سرسیدؒ کا قلم دلائل و براہین کی پوری قوت سے مسلح ہو کر حرکت میں آیا اور اُس نے برطانوی حکومت پر واضح کیا کہ مسلمانوں کو اپنا ازلی دشمن سمجھنا نہ صرف غلط فہمی پر مبنی ہے بلکہ بددیانتی پر بھی۔ اور اس بنا پر مسلمانوں کو مٹانے کی کوشش حاکمانہ فراست کا کوئی اچھا مظاہرہ ثابت نہیں ہوگی۔ تاریخ گواہ ہے کہ سرسیدؒ کا یہ تیر نشانے پر بیٹھا اور برطانوی حکومت کے مدبرین نے مسلمانوں کے خلاف اپنے نقطۂ نظر اور پالیسی کو تبدیل کرنا ہی مناسب سمجھا۔ اندازہ لگایئے کہ اگر سرسیدؒ کی یہ مصلحت کوشی اور دوربینی اس نازک وقت پر آڑے نہ آتی تو آج اس ملک کا نقشہ کیا ہوتا۔ اپنی اس حکمتِ عملی سے سرسیدؒ نے نہ صرف اپنی قوم کو موت کے چنگل سے نجات دلائی بلکہ اُس کے لئے ایک زندہ اور باوقار قوم کی راہیں بھی ہموار کیں۔

جہاں تقاضائے وقت کی مصلحتوں کی بنا پر سرسید نے یوں ہماری مسیحائی کی وہاں اس کی غیرت نے اسلام اور مسلمانوں کی عزت و ناموس کے معاملہ میں کبھی اپنے اندر نہ تو لچک آنے دی اور نہ ہی مصلحت اور کمزوری کو اپنایا۔ ڈاکٹر ہنٹر برطانوی سلطنت کے ممتاز مدبر اور سرسیدؒ کے گہرے دوست تھے۔ انھوں نے جب "انڈین مسلمانز" نامی کتاب لکھ کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "مسلمان ازروئے ایمان سلطنت کے باغی ہیں" تو مسلمانوں کے لئے یہ بڑا ہی نازک اور کڑا وقت تھا۔ بنگال میں وہابی تحریک کا معاملہ ابھرا ہوا تھا اور وہاں کے انگریز چیف جسٹس مسٹر نارمن ایک مسلمان کے ہاتھوں قتل ہو گئے تھے۔ لیکن تمام مصلحتوں کو ٹھکرا کر سرسیدؒ فوراً خم ٹھونک کر میدان میں نکلے اور ڈاکٹر ہنٹر کے الزامات کا وہ منہ توڑ جواب دیا کہ اُسے اور تو اور خود اپنی قوم کے ان لوگوں کی ملامتیں برداشت کرنی پڑیں جو سرسیدؒ کے ریویو سے پہلے اُس کی کتاب سے متاثر ہو کر مسلمانوں سے شدید طور پر بدظن ہو گئے تھے۔ سرسیدؒ کی اس جراءت نگارش نے ذہنوں سے گرد و غبار کو دھو ڈالا۔ اور برطانوی حکمران ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق اپنی روش پر نظرِ ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ڈاکٹر ہنٹر کے بعد سرسیدؒ کو سر ولیم میور سے نبرد آزما ہونا پڑا۔ سر ولیم یہاں برطانوی حکومت کے بہت بڑے ستون تھے۔ ایک یو پی کے گورنر ۔۔۔ اور اس زمانہ کے گورنر! لیکن جب انھوں نے "لائف آف محمدؐ" کی چار جلدیں شائع کر کے اسلام اور حضور رسالتمآبؐ کی سیرتِ طیبہ پر گھناؤنی تنقید سے کام لیا تو سرسیدؒ کا جوشِ غضب دیوانگی کی حد تک پہونچ گیا۔ ان کا دن کا چین اور رات کی نیندیں حرام ہو گئیں۔ اور جب جواب لکھنے کے لئے یہاں سے ضروری مواد نہ ملا تو انگلستان پہنچے۔ وہاں کی لائبریریوں کی ورق گردانی کی۔ فرانس، مصر اور دیگر ممالک سے کتابیں منگوائیں۔ اور دن رات کی مسلسل عرق ریزی اور جانفشانی سے اُس کا جواب "خطباتِ احمدیہ" کی صورت میں انگلستان

This page is already at No 14
Page 70 is not printed

سے شائع کیا۔ اندازہ لگائیے اُس شخص کے کردار کی عظمت کا کہ جب بھی دینی غیرت کا کوئی تقاضا سامنے آیا وہ حکومت کے ہر بڑے سے بڑے ستون سے بے خوف و خطر ٹکرا گیا۔ اور اس راہ میں نہ کبھی ملازمت کا سوال سدِ راہ ہوا اور نہ کوئی دوسری مصلحت اور مفاد۔

انگریز اور اس کی حکومت کے معاملہ میں سرسید کی حق گوئی و بے باکی کا ایک اور شاہکار سرسید کی مشہور تصنیف "رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند" ہے۔ انگریز حکمرانوں کے دلوں میں ابھی ۱۸۵۷ء کی بغاوتِ ہند کے زخم بالکل تازہ تھے اور ہندوستانیوں بالخصوص ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف ان کے دلوں میں غیض و غضب کی آگ بے طرح بھڑک رہی تھی۔ مارشل لاء کا دور دورہ تھا۔ چوراہوں تک میں پھانسیاں نصب تھیں۔ سامراجی خوف و ہراس کی اس بھیانک فضا میں سرکاری ملازمت کے باوجود سرسیدؒ کے قلم میں حرکت پیدا ہوئی اور بلا خوف لومۃ لائم اُس نے مذکورہ رسالہ شائع کر کے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا۔ حکمرانوں میں اس کتاب کی اشاعت سے جو غم و غصہ پیدا ہوا اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اُس وقت کے فارن سکریٹری مسٹر سیسل بیڈن نے ایک دھواں دھار تقریر میں سرسید کی کتاب کو "باغیانہ مضمون" قرار دیا اور مطالبہ کیا کہ مصنف کو کڑی سزا دی جائے۔ لیکن سرسیدؒ نے حکمرانوں کی دھمکیوں کو پرکاہ کے برابر وقعت نہ دی۔

برطانیہ کی ہیبتناک امپریلزم کے خلاف یہ "آئینِ جوانمرداں" بھی اگر سرسیدؒ کی انگریز پرستی کی دلیل ہے تو اس "انگریز پرستی" پر بڑی سے بڑی حریت پرستی کو قربان کیا جا سکتا ہے۔

یہ ہمارے عظیم المرتبت زعیم قوم کی عظمت کی چند جھلکیاں ہیں۔ اُس کی یہ عظمت، قیادت کے لاتعداد گوشوں میں پھیلی ہوئی ہے اور اس کا وہ کونسا گوشہ ہے جو مستحقِ تحسین و تبریک نہیں۔ دارالعلوم علی گڈھ کی تعمیر ہی کو سامنے لائیے۔ کتنا بڑا کارنامہ ہے جو اس کے عزم بلند اور جوشِ کردار سے حاصلِ تکمیل کو پہنچا۔ اس کے لئے اسے کس قدر جان توڑ جدوجہد، بے پناہ تگ و تاز اور بے مثال جانفشانی سے کام لینا پڑا اُس کا صحیح اندازہ شاید ہم آج نہ لگا سکیں۔ اس سعیِ مسلسل کے دوران میں اُس کے پیشِ نظر کیا مقصدِ عظیم تھا یہ جاننے کے لئے ہمارے ایک نامور مفکر اور ادیب صلاح الدین احمد کے ان الفاظ کو سامنے لائیے۔

> وہ علی گڈھ کو مسلم لیڈر شپ کے لئے ایک زندہ و پائندہ تربیت گاہ بنانا چاہتے تھے۔ سرسیدؒ کی دوربینی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کام وہ اپنی زندگی میں شروع کر جائیں گے اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور محیط کل ہو جانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پروگراموں کی بجائے وہ پروگرام بنانے والے پیدا کریں جو اپنے اپنے حالات کے مطابق اس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں جو انھوں نے ملتِ اسلامیہ ہند کی فلاحِ عام کے لئے تیار کیا تھا..... چنانچہ علی گڈھ کو انھوں نے اس نمونے پر تیار کیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی وحدتِ خیال کا مرکز بن گیا اور بیداری و رہبری کی جو لہریں یہاں سے منتشر ہوئیں وہ برِعظیم ہند کے ہر گوشے میں پہونچ کر اثر آفریں ثابت ہوئیں۔ (مقالہ۔ سرسید احمد خاں پر ایک نظر)

دارالعلوم علی گڈھ قومی نشوونما کا اس قدر عظیم اور مرکزی شاہکار تھا کہ ایک ایرانی نکتہ رس نے جب اسے دیکھا تو بے ساختہ کہا "جو کام حکومت کی طاقت سے باہر تھا اسے ایک تنہا انسان نے پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا"۔ اس دارالعلوم کے صدقے میں ہمارا قومی خزانہ کیسے کیسے

This page is already at No 15
Page 71 is not printed

گہرہائے آبدار سے مالا مال ہوا۔ اس کا جواب تاریخ کے مؤرخ سے پوچھئے۔ علی گڈھ نے طلب علم کی جو آرزوئیں اور امنگیں اسلامیانِ ہند کے دلوں میں پیدا کیں۔ انھوں نے پوری قوم کا رُخ بے راہ روی اور جہالت پسندی سے حصولِ علم کی طرف پھیر دیا اور ہم بلا تامل کہہ سکتے ہیں کہ اگر سرسید کا یہ شاہکار سامنے نہ آتا تو اس ملک کی فضاؤں میں نہ محمد علی جوہر اور ظفر علی کے نعرہ ہائے حریت سنائی دیتے۔ نہ اقبالؒ کے حیات آفریں نغموں کی گونج فردوسِ گوش بنتی اور نہ وہ قائد اعظم میدانِ قیادت میں نظر آتا جس کا تدبر برطانوی سامراج اور ہندو راج کے لئے ملک الموت ثابت ہوا اور مسلمانوں کے لئے ایک عظیم مملکت کا اسلامی معمار۔

میدانِ عمل کی ان کارفرمائیوں سے ہٹ کر سرسیدؒ کے خلوص فکر و نظر کی معجز نمائیوں کی طرف آیئے تو یہاں بھی قدم قدم پر سرِ راہ وہ روشن چراغ نگاہوں کے سامنے آئیں گے جو اس منزل پر آگے بڑھنے والوں کے لئے دلیلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہاں بھی وہ ان سب کا راہ نما دکھائی دے گا جو اپنے دلوں میں ذوقِ سفر کی تڑپ رکھتے ہیں اور ماضی کے سرمائے پر تکیہ کر کے وقت کے تقاضوں کے سامنے سپر انداز ہونا قبول نہیں کرتے بلکہ آنے والی نسلوں کے لئے افکارِ تازہ کی متاعِ بے بہا چھوڑ جاتے ہیں۔

تحریر و تقریر اور علمی و فکری تحقیقات کے میدان میں بھی سرسید کی تالیف و تصنیف کا سلسلہ کافی وسعت رکھتا ہے۔ جہاں انکی تقریر و خطابت۔ خراجِ تحسین وصول کیا وہاں اس نے اپنی گرانمایہ تصانیف کا بہت بڑا سلسلہ بھی قوم کے علمی سرمایہ میں شامل کیا۔ دیگر اہم تصانیف سے قطع نظر ہم ان کی تفسیر القرآن کی طرف آتے ہیں۔ ان کے مکتبِ فکر کے مخالفین اس تفسیر کو نشانۂ تنقید بنا سکتے ہیں اور آج کے نئے ارتقائی کیٹ فارموں سے یہ دعویٰ بھی بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے کہ فلاں مقام پر انھوں نے اجتہادی ٹھوکر کھائی۔ اور فلاں معاملہ میں ان کی قرآنی فکر اور دینی تفقہ میں غلطی کا امکان ہے۔ لیکن ہو چکے کہ ایک نبی کے علاوہ دوسرا کون ہے جس کی ہر بات کو حرفِ آخر قرار دیا جا سکتا ہے اور پھر یہ بھی یاد رکھئے کہ دین کے معاملہ میں مسلکِ تقلید کو ٹھکرا کر تفقہ فی الدین کا پہلا علمبردار سرسید ہی تو تھا۔ اسی نے مدتوں کے بعد اس باب کا از سرِ نو افتتاح کرنے کی جرأت کی اور پھر ثابت کیا کہ ایمان وہی ہے جو علیٰ وجہ البصیرت پیدا ہو۔ آج جبکہ دین کے معاملہ میں فکری اصلاح و ارتقاء کے لحاظ سے ہم ایک صدی آگے بڑھ آئے ہیں سرسیدؒ کے سرمائے میں شاید کوئی تنوع اور ندرت نظر نہ آئے بلکہ اس میں کئی مقامات پر غلطیاں بھی دکھائی دے سکتی ہیں۔ لیکن یہ بھی تو اندازہ لگائیے کہ ایک صدی قبل ان قلمی کاوشوں کی قدر و قیمت کیا ہو گی۔ چراغ کی روشنی برقی قمقموں کی موجودگی میں دلکشی پیدا نہیں کرتی۔ لیکن مدتوں کے گھٹا ٹوپ اندھیروں میں یہ چراغ کتنا انمول دکھائی دے گا۔ اس حقیقت کو نظر انداز نہ کیجئے کہ سرسید نے یہ چراغ اُس وقت روشن کیا جب اندھیروں میں بھٹکتے مسافر روشنی کی ایک کرن تک کو ترس گئے تھے۔ سرسیدؒ پہلا شخص تھا جس نے اس حقیقت کو کماحقہٗ محسوس کیا۔ صدیوں کے طویل دورِ ملوکیت میں عالمِ اسلام کی فکری صلاحیتوں پر جو مسلسل پہرے بٹھائے گئے تھے اور اس میں مفاد پرستیوں کے تحت جو کچھ مذہبی رنگ پیدا کیا گیا تھا وہ جزو دین اور بالآخر عین دین بن گیا۔ اور پھر یہ ناممکن ہو کر رہ گیا کہ اصل اسلام کی عالم آرا اقدار اُبھر کر سامنے آسکیں۔ یہ بڑا ہی نازک مرحلہ تھا اور یہاں ادنیٰ سی جرأت بھی بدترین مخالفتوں اور تکفیر کے فتووں کا شکار ہو سکتی تھی۔ لیکن سرسیدؒ یہاں بھی سب کے بالمقابل سینہ سپر ہو گیا۔ اور قرآن کریم کی روشنی میں مذہبی اجارہ داروں کے خود ساختہ مذہب کو بے نقاب کر کے رکھ دیا۔ یہ موقع نہیں کہ ہم سرسید

This page is already at No 16
Page 72 is not printed

کی تفسیر القرآن یا دیگر دینی افکار پر بحث کریں اور نہ ہی ہم یہ دعویٰ کرتے ہیں (خود سرسید نے بھی یہ دعویٰ نہیں کیا بلکہ ہر ایک کو اپنی فکری تقلید سے بشدت روکا) کہ ان کی فکر کو دین کے معاملے میں حرفِ آخر یا غلطیوں سے مبرا قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ تو پورے دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی جرأتِ مردانہ نے ہمارے لئے غلط اور صحیح کو پرکھنے کی راہ کھول دی اور اس طرح ہمارے اس حق کو بحال کیا جو خدا کا دین ہر مومن کو عطا کرتا ہے۔

ایسا نظر آتا ہے کہ تفسیر القرآن لکھ کر سرسید نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا۔ مذہبی اجارہ دار جن کی باہمی فرقہ بازیوں کی آگ صدیوں سے خرمنِ ملت کو جلاتی چلی آ رہی ہے اور آج تک کبھی دھیمی نہیں پڑی۔ سب کے سب ایک متحدہ محاذ بنا کر "ایک سرسید" کے خلاف میدان میں آ نکلے اور ملک کے طول و عرض میں طوفان برپا کر دیا۔ تکفیر کے ترکش کا ہر تیر اپنے ارمان پورے کرنے کے لئے حرکت میں آیا۔ قتل کی دھمکیوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ اپنے ساتھ چھوڑ کر بے گانے ہو گئے۔ "خود ساختہ جانشینانِ رسول" نے اسے اپنے فتووں میں "شیطان" اور "ابلیسِ لعین" کہہ کر "خلقِ عظیم" کا ثبوت دیا۔ لیکن عزم و استقلال کا یہ پہاڑ اپنے مقام پر جما رہا۔ اس عالم میں بھی اس کے ولولوں اور مسکراہٹوں کی شان بدستور قائم تھی۔ وہ ایسے دل گردے کا انسان تھا اور اپنی ملت کا درد اس کے قلب و دماغ پر اس طرح چھایا ہوا تھا کہ تکفیر اور گالی گلوچ کے اُن "کارناموں" کے دوران میں جب وہ لاہور آیا تو ایک اجتماعِ عظیم میں تقریر کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

> اے بزرگانِ پنجاب! میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی کی کوشش کرے تو کیا آپ اُسے اپنا خادم اور خیر خواہ نہیں سمجھیں گے؟ آپ کے لئے دولت سرائیں بنانے میں جس میں آپ آرام کرتے ہیں اور آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں یا آپ کے لئے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدائے ذوالجلال کا نام پکارتے ہیں، چمار، قلی، کافر، بُت پرست، بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں۔ مگر آپ نہ کبھی اس دولت خانہ کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ مسجد کے منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں۔ آپ مجھے بھی اس مدرسہ کے قائم کرنے میں ایک قلی اور چمار کی مانند تصور کر لیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لئے گھر بننے دیجئے۔ (حیاتِ جاوید)

یہ تھا وہ سرسید جو بقول ایک بہت بڑے انگریز کے "اگر یورپ میں ہوتا تو وہاں کی کسی بہت بڑی سلطنت کا وزیر اعظم ہوتا"۔ لیکن سرسید تو ایک دم ٹوٹتی قوم کو موت کے منہ سے بچانے کے لئے آیا تھا۔ اور واقعی اس کی یہ مسیحائی تاریخ کا ایک درخشندہ باب بن چکی ہے اور اُس کی عظمت کا فلک بوس مینار۔ اس کے گرد اگرد وہ رفیقِ کار جمع ہو گئے تھے۔ جن میں سے ایک ایک اپنی اپنی جگہ نمایاں حیثیت کا مالک تھا۔ محسن الملک، وقار الملک۔ مولانا حالی۔ کس کس کا نام لیا جائے۔ یہی ایثار پیشہ زعیم تھا جو ہمیشہ ذاتی صلہ اور شہرت سے بے نیاز رہا۔ اور جب کبھی اُس سے اس کی سوانح حیات قلمبند کرنے کی گفتگو ہوئی تو اس نے ہمیشہ یہی کہا۔

> میری لائف میں اس کے سوا اور رکھا ہی کیا ہے کہ لڑکپن میں خوب گیڈیاں کھیلیں۔ کنکوے لڑائے۔ کبوتر پالے۔ ناچ نجرے دیکھے۔ اور بڑے ہو کر نیچری، کافر اور بے دین کہلائے۔ (حیاتِ جاوید)

ہیں کہ معتزلہ کی یہ آراء ایک نئے رجحان کی ترجمان تھیں۔

اسی کے قریب قریب عبدالقادر بغدادی نے اپنی کتاب "الفرق بین الفرق" میں لکھا ہے کہ "حسن بصریؒ نے جب واصل کو اپنی مجلس سے نکال دیا۔ اور وہ بصرہ کی مسجد کے ایک ستون کے قریب الگ ہو کر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ اس کا دوست عمرو ابن عبید بھی آملا تو لوگوں نے ان دونوں کے بارے میں کہا کہ "یہ دونوں امت کے قول سے الگ ہو گئے ہیں"۔ اسی دن سے ان کے متبعین کا نام معتزلہ پڑ گیا۔

اسی کے قریب قریب وہ بیان بھی ہے جو سمعانی کی کتاب الانساب میں نقل ہوا ہے کہ معتزلی، اعتزال کی طرف نسبت ہے اعتزال کے معنی الگ ہونے اور اجتناب برتنے کے ہیں۔ وہ جماعت جو اس عقیدہ کے ساتھ مشہور ہے اس نام سے اس لئے موسوم ہوئی کہ عمرو بن عبید نے نئی بدعات پیدا کیں اور حسن بصریؒ کی مجلس سے الگ ہو گیا۔ اور اس کے ساتھ ایک جماعت بھی الگ ہو گئی۔ اسی وجہ سے ان کا نام معتزلہ پڑ گیا۔[1]

(سوم) "مروج الذہب" میں مسعودی کے بیان سے ایک تیسری رائے معلوم ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان کو معتزلہ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ مرتکب کبیرہ کافروں سے بھی الگ ہو جاتا ہے اور مومن سے بھی۔ یعنی ان کی رائے کے مطابق معتزلہ اس بات کے قائل ہیں کہ مرتکب کبیرہ الگ ہو جاتا ہے۔

دونوں آخری رائیں ذرا مختلف ہیں اگرچہ ان دونوں میں بڑا باریک سا فرق ہے۔ دوسری رائے کے مطابق اعتزال خود اس فرقہ کا وصف ہے کیونکہ اس نے ایک نیا عقیدہ پیدا کیا اور اس طرح وہ اپنے سے پہلے جس قدر اقوال تھے۔ ان سب کے خلاف چلے گئے اور تیسری رائے کے مطابق اعتزال دراصل مرتکب کبیرہ کا وصف ہے۔ اور اس فرقہ کا نام معتزلہ اس لئے رکھ دیا گیا کہ یہ فرقہ مرتکب کبیرہ کو مومنین اور کافرین سب سے الگ تسلیم کرتا ہے۔[2]

یہ تمام اقوال ہمیں بہر حال ان دو نتیجوں تک ہی پہنچاتے ہیں۔

(۱) اعتزال امام حسن بصری اور ان کے دونوں شاگردوں واصل ابن عطاء اور عمرو بن عبید کے گرد ہی وجود آشنا ہوا۔

(۲) اعتزال چند خالص دینی مسائل کے گرد گردش کرتا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا یہ دونوں نتیجے صحیح ہیں؟

---

(۱) سمعانی صفحہ ۵۳۳۔ عبارت ذرا دقیق ہے جس میں پہلی اور دوسری دونوں رایوں کا احتمال ہے۔ اگرچہ عبارت کے الفاظ دوسری رائے کے زیادہ قریب ہیں۔

(۲) اپنی اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کی طباعت کے وقت میری رائے یہ تھی کہ ان لوگوں کو معتزلہ کا لقب دینے والے دراصل یہودی تھے۔ اور انھوں نے ان کو اپنے ہاں کے ایک لفظ "الفروشیم" کے تتبع میں یہ لقب دیا تھا جس کے معنی اعتزال ہی کے ہیں۔ کوئی بعید نہیں کہ معتزلہ پر اس لقب کا اطلاق ان یہودیوں نے کیا ہو جو مسلمان ہو گئے تھے۔ کیونکہ "الفروشیم" اور معتزلہ میں یہ یکسانیت پائی جاتی تھی کہ دونوں فرقے تقدیر وغیرہ پر بحث کرتے تھے لیکن مزید غور و فکر کے بعد میں نے اس رائے سے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھا۔ (مصنف)

مصنف کی رائے

تاریخ کی بیشتر کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ "اعتزال" "معتزلہ" اور "معتزلی ہوگیا" کے الفاظ زیادہ تر ابتدا السلام میں بھی استعمال ہوتے رہے ہیں اور خاص معنوں میں استعمال ہوتے رہے ہیں۔ وہ خاص معنی یہ تھے کہ کوئی آدمی دو باہم قتال یا نزع کرنے والی جماعتوں کو دیکھتا اور کسی ایک کی رائے سے بھی مطمئن نہ ہوتا بلکہ سمجھتا کہ مجھے ان میں سے کسی فریق کے ساتھ بھی قتال یا نزاع میں شریک نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ وہ ابھی تک اپنی رائے کو مجتمع کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا تھا یا وہ سمجھتا تھا کہ ان میں سے ہر دو فریق باطل پر ہیں۔ تو ایسی صورت میں ہم دیکھتے ہیں کہ مورخین اس لفظ کا اطلاق اس گروہ پر کردیتے ہیں جو جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ میں سے کسی کے ساتھ شریک نہیں ہوا تھا۔ ایسے ہی ان لوگوں پر بھی یہ لفظ بول دیتے ہیں جو جنگ صفین میں نہ حضرت علیؓ کے ساتھ شریک ہوئے اور نہ امیر معاویہؓ کے ساتھ۔

صدر اول میں اعتزال

تاریخ طبری میں ہے کہ قیس بن سعد نے جو حضرت علیؓ کی طرف سے مصر کے گورنر تھے۔ ان کو لکھا تھا۔ "ادھر کچھ لوگ ایسے ہیں جو غیر جانب دار (مُعْتَزِلِیْنَ) ہیں انھوں نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں ان سے تعرض نہ کروں اور انھیں ان کے حال پر چھوڑ دوں۔ تاآنکہ لوگوں کے معاملات یکسو ہو جائیں۔ اس کے بعد وہ کوئی رائے قائم کرسکیں گے۔ میری رائے بھی یہی ہے کہ میں ان سے کوئی تعرض نہ کروں اور ان سے جنگ کرنے میں جلدی نہ کروں بلکہ اس عرصہ میں ان کی تالیف قلب کرتا رہوں۔ شاید خدا ان کے دلوں کو ہماری طرف مائل کردے اور خدا چاہے تو وہ انھیں ان کی گمراہی سے الگ کردے"[1]

طبری ہی میں ایک دوسرے مقام پر ہے۔ محمد بن ابی بکر نے پورے ایک ماہ بھی صبر نہیں کیا اور ان مُعْتَزِلِیْنَ (غیر جانبدار لوگوں) کی طرف ہدی بھیج کر انھیں بلوایا جن سے قیس نرمی اور ملاطفت کا برتاؤ کرتے رہتے تھے۔ محمد بن ابی بکر نے ان سے کہا کہ یا تو ہماری وفاداری اختیار کرو یا ہمارے ملک سے نکل جاؤ۔ ان لوگوں نے محمد بن ابی بکر کو جواب کہلوا دیا کہ ہم ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی نہیں کریں گے۔ ہمیں چھوڑ دیجئے تاآنکہ ہم دیکھ لیں کہ معاملات کس کروٹ بیٹھتے ہیں اور ہم سے جنگ کرنے میں جلدی نہ کیجئے"[2]

اسی طرح کی عبارت ابن الاثیر اور ابوالفداء کی تاریخوں میں بھی آئی ہے۔ بلکہ اس موضوع پر ابوالفداء کی عبارت زیادہ واضح ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "ان لوگوں کا نام معتزلہ اس لئے رکھا گیا کہ وہ حضرت علیؓ کی بیعت کرنے میں الگ تھلگ اور غیر جانبدار رہے" اس عبارت میں اس کی تصریح موجود ہے کہ حضرت علیؓ کے عہد کے ان لوگوں پر بھی "معتزلہ" کا لفظ بولا جاتا تھا۔ اس سے ہم مندرجہ ذیل دو نتیجے نکال سکتے ہیں جو مشہور نتیجہ سے مختلف ہیں۔

(اول) امام حسن بصریؒ کے مدرسہ سے ایک صدی پہلے اس لفظ کے ساتھ ایک خاص جماعت کا نام رکھا جاچکا تھا۔ اور

---

[1] تاریخ طبری ص ۲۴۴۔ ج ۱ طبع یورپ

[2] ایضاً طبری

واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید کے اسکول پر اس لفظ کا اطلاق اسی پرانے نام کا احیاء تھا کوئی نئی اصطلاح نہیں تھی۔ اور اس لئے ہمارے لئے یہ بہت ہی دشوار ہے کہ ہم اس رائے کو تسلیم کر لیں کہ یہ نام ـــــ جو پہلے سے مشہور تھا اور جس کا ایک خاص رنگ تھا ـــــ محض اس لئے بولا جانے لگا تھا کہ واصل بن عطاء ایک ستون سے دوسرے ستون کی طرف منتقل ہو گئے تھے۔

(دوم) یہ نام ـــــ یعنی اعتزال ـــــ ان لوگوں پر بولا گیا تھا جو جنگ جمل سے الگ رہے اور جنگ صفین میں شریک نہیں ہوئے تھے۔ یہ مسائل جن کے محور پر جنگ و جدل گردش کرتی تھی ـــــ خالص سیاسی مسائل تھے۔ مثلاً قتل عثمانؓ۔ قاتلینِ عثمانؓ سے قصاص۔ علی رضی اللہ عنہ اور ان کا استحقاقِ خلافت، امیر معاویہؓ اور یہ کہ کیا وہ حضرت علیؓ سے زیادہ خلافت کے حقدار تھے، وغیر ذلک سب کے سب سیاسی مسائل تھے۔ اور لوگوں کا ان مسائل کی بنا پر دو گروہوں میں بٹ جانا بھی سیاسی گروہ بندیوں سے ہرگز زیادہ نہیں تھا۔ لیکن ہمیں یہ اعتراف کر لینا چاہیئے کہ اس زمانہ میں مسائل خواہ اجتماعی ہوں یا اقتصادی، سیاسی ہوں یا شخصی سب کے سب دینی رنگ میں رنگے ہوئے ہوتے تھے۔ (چنانچہ خانگی نظام، تجارتی تعلقات، مالیاتی معاہدے وغیر ذلک سب کے سب دین کے رنگ میں رنگ دیئے جاتے تھے اور ہر بات میں دین ہی کا نام لیا جاتا تھا) لہٰذا وہ جماعت یا گروہ جس پر صدرِ اول (ابتداء عہدِ اسلام) میں معتزلہ کا لفظ بولا گیا وہ بھی درحقیقت ایک سیاسی فکر کی نمائندگی کرتا تھا جسے دین کا رنگ دیدیا گیا تھا۔ اگر اس جماعت کی رائے کا خلاصہ ہم ایک لفظ میں بیان کرنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں ـــــ اس جماعت کا یہ خیال تھا کہ ان دونوں متنازع جماعتوں میں سے حق کسی ایک کے ساتھ بھی نہیں ہے۔ دونوں کے دونوں باطل پر ہیں۔ یا کم از کم یہ کہ ان پر یہ بات کھل کر واضح نہیں ہوئی تھی کہ حق ان میں سے کون سے فریق کے ساتھ ہے۔ دین ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دیتا ہے جو بغاوت کے مرتکب ہوئے ہوں۔ لیکن جب دونوں کے دونوں گروہ باغی ہوں یا یہ متعین نہ کیا جا سکے کہ ان میں سے کون سا باغی ہے تو ہمیں ان دونوں سے یکسو رہنا چاہیئے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے۔ وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ (اگر مومنوں میں سے دو جماعتیں باہم جنگ کرنے لگیں تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو۔ اگر ان میں سے ایک جماعت بغاوت پر آمادہ ہو اور دوسری جماعت پر زیادتی کرے تو اس جماعت سے جنگ کرو جو بغاوت پر آمادہ ہے تا آنکہ وہ خدا کے فیصلہ کی طرف لوٹ آئے)

صدرِ اول کے معتزلہ اور دوسری صدی کے معتزلہ

اب یہاں ایک سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ کیا صدرِ اوّل کے ان معتزلہ میں اور واصل بن عطاء اور اس کے ہم خیالوں کے معتزلہ کے درمیان کوئی مشابہت موجود ہے۔ اور کیا ان لوگوں کا کوئی رجحان بھی ویسا ہی سیاسی اور دینی تھا جیسا کہ پہلے لوگوں کا تھا؟

اکثر کتابیں اسی طرف جاتی ہیں کہ امام حسن بصری اور واصل بن عطاء کے درمیان اختلاف کا مرکز ـــــ جو سب سے پہلے پیدا ہوا ـــــ وہ مرتکبِ کبیرہ کے متعلق یہ حکم تھا کہ کیا وہ کافر ہے یا مومن ہے؟ یہ مسئلہ اگرچہ بظاہر خالص دینی مسئلہ معلوم ہوتا

ہے لیکن اس کی گہرائیوں میں بڑے بڑے خطرناک سیاسی مسائل لپٹے ہوئے تھے۔

خوارج کا تشدد

اس کی تفصیل یہ ہے کہ اس مسئلہ میں معتزلہ نے مرجیہ سے بھی مخالفت کی اور خوارج کے مشہور فرقے ازارقہ سے بھی۔ خوارج کا خیال تھا کہ اوامر دین ـــــ نماز، روزہ، صدق وعدل ـــــ پر عمل کرنا ایمان کا جزو ہے۔ ایمان محض اعتقاد ہی کا نام نہیں ہے جو شخص لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر اعتقاد رکھے لیکن فرائض دین پر عمل نہ کرے اور نہ ہی کبائر سے احتراز برتے تو ایسا آدمی کافر ہوگا۔[1] نافع بن الازرق نے تو بڑے مبالغہ سے کام لیا۔ اور اپنے فرقہ کے علاوہ اس نے تمام لوگوں کو کافر قرار دیدیا تھا ـــــ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ـــــ وہ کہتا تھا کہ اس کے مومن ساتھیوں کے لئے نہ دوسرے لوگوں کے ذبیحے کھانے جائز ہیں اور نہ ان میں شادی بیاہ کرنا جائز ہے۔ خوارج دوسرے فرقوں کے لوگوں کے وارث نہیں ہو سکتے اور نہ دوسرے لوگ خوارج کے وارث ہو سکتے ہیں۔ ان کا حال کفار عرب اور بُت پرستوں جیسا ہے کہ ان سے سوائے اسلام اور تلوار کے کوئی اور چیز قبول نہیں کی جا سکتی۔" ان تعلیمات کے بڑے خطرناک سیاسی نتائج تھے۔ ان تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ خوارج خلفائے بنو امیہ کے سامنے جنگی میدان میں اتر آئے تھے۔ کیونکہ اموی ان کی نگاہوں میں مرتکب کبائر تھے۔ فلہٰذا کافر تھے۔ ان کا حال وہی تھا جو دوسرے بُت پرستوں کا تھا۔ لہٰذا ضروری تھا کہ ان کی خلافت کا انکار کیا جائے۔ کیونکہ خلیفہ کے لئے سب سے پہلی شرط مسلمان ہونا ہے۔ بلکہ ان کے نزدیک امویین سے اس وقت تک جنگ لڑنا واجب تھا جب تک وہ ان کا مذہب قبول نہ کرلیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ امویین کا خلافت کا حقدار نہ ہونا اور خوارج کا ان سے جنگ کرنا اور اس جنگ کا واجب ہونا اگرچہ سیاسی مسائل تھے مگر ان پر کس طرح دینی رنگ چڑھا ہوا تھا۔ خوارج نے اپنی اس فکر کو عملی جامہ پہنایا۔ چنانچہ ان کی پوری تاریخ مسلسل جنگوں کی تاریخ ہے۔

مرجیہ کا تساہل

رہ گئے مرجیہ تو وہ خوارج کے بالکل ہی برعکس تھے۔ انھوں نے کہدیا تھا کہ ایمان محض قلبی اعتقاد کا نام ہے۔ تکالیف ـــــ یعنی نماز، روزہ وغیرہ ـــــ ایمان کا جزو نہیں ہیں۔ کبائر کا ارتکاب ایک انسان کو ایمان سے خارج نہیں کر دیتا۔ انھوں نے مومن کے دائرہ کو انتہائی حدود تک وسیع کر دیا تھا جبکہ خوارج نے اسے اتنا تنگ کر دیا تھا کہ ان کے سوا اس میں کسی دوسرے کے لئے گنجائش ہی نہیں رہی تھی بلکہ ازارقہ کے نزدیک تو ان کے فرقہ کے لوگوں کے علاوہ باقی تمام مسلمان کافر تھے۔ مرجیہ کے متعلق تو اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر نقل کیا جاتا ہے چنانچہ شہرستانی نے ان کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ یہاں تک کہتے تھے کہ "ایمان کے ساتھ معصیت اور نافرمانی قطعاً نقصان دہ نہیں۔ بالکل اسی طرح جیسا کہ کفر کے ساتھ اطاعت اور فرماں برداری قطعاً فائدہ مند نہیں ہوتی۔" اس انداز فکر کے ـــــ بلاشبہ ـــــ سیاسی نتائج بھی تھے۔ ان میں سے اہم ترین نتیجہ یہ تھا کہ انھوں نے اپنے اس نظریہ کی ان تمام سیاسی اور مذہبی اختلافات سے تطبیق دے رکھی تھی جو اب تک مسلمانوں کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کے نزدیک نہ حضرت عثمانؓ اور ان کے مددگار کافر تھے اور نہ ہی ان کے خلاف بغاوت کرنے والے کافر تھے۔ اسی طرح حضرت علیؓ اور ان کے متبعین اور حضرت عائشہؓ

[1] اس بارہ میں شہرستانی کی "الملل والنحل" اور ابن حزم کی "الفصل" اور اشعری کی "مقالات الاسلامیین" نیز "الفرق بین الفرق" ملاحظہ کیجیے۔

اور ان کے متبعین میں سے کوئی بھی اسلام سے خارج نہیں تھا۔ اسی طرح جو لوگ حضرت علیؓ کے جھنڈے کے نیچے جنگ کر رہے تھے وہ بھی کافر نہیں تھے اور جو لوگ حضرت معاویہؓ کے جھنڈے تلے مصروف جنگ تھے وہ بھی کافر نہیں تھے بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ ایمان کا مسئلہ خالص قلبی مسئلہ ہے۔ ایمان لے آنے کے بعد آدمی جس قسم کا چاہے عقیدہ رکھے اور اپنے عقیدہ کے مطابق جس طرح چاہے عمل کرے۔ وہ ٹھیک راستہ پر ہے۔ چاہے اس نے حضرت عثمانؓ کی مدد کی ہو یا ان کے خلاف بغاوت کی ہو خواہ وہ حضرت علیؓ کے ساتھ رہا ہو یا امیر معاویہؓ کے ساتھ۔

اس زاویۂ نظر کا فطری نتیجہ یہ تھا کہ خلفائے بنو امیہ کتنا ہی کبائر کا ارتکاب کرتے رہیں وہ مومن تھے جیسا کہ ان کے دشمن بھی مومن تھے۔ اس کا یہ نتیجہ بھی تھا کہ امویوں سے جنگ کرنے اور ان کی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوششوں میں وہ خوارج کے ساتھ نہیں تھے۔ اس رائے میں ——— یعنی ارجاء کی رائے میں ——— اموی حکومت کی تائید تھی ——— اگرچہ یہ تائید ایجابی نہیں بلکہ محض سلبی تھی۔ یہ تائید اس حد تک تھی کہ نہ مرجیئہ ان کے دشمن تھے نہ ان کے خلاف بغاوت کرتے تھے اور نہ ہی ان پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ عملی طور پر اکثر ان کی تائید بھی کر دیتے ہیں۔ ثابت قطنہ جو فرقۂ مرجیئہ کا ایک نامور شاعر اور خطیب تھا یزید بن المہلب کے لئے کام کرتا تھا اور سرحدی معاملات میں اپنی خدمات ... اس نے یزید کو بڑے بڑے فائدے پہنچائے۔ یزید اس کی بڑی قدر کرتا تھا۔ وہ نہایت فصیح و بلیغ کاتب (وزیر) اور انتہائی شجاع اور بہادر آدمی تھا۔ بظاہر ایسا ہی نظر آتا ہے کہ بنو امیہ نے فرقۂ مرجیئہ کو ——— علی العموم ——— اپنا دشمن نہیں سمجھا جیسا کہ انھوں نے ان کو کبھی اپنا دوست بھی نہیں سمجھا۔ جہاں ضرورت پڑی ان کی خدمات سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔

اس تفصیل سے آپ نے دیکھ لیا کہ خوارج کا موقف انتہائی شدید تھا کہ وہ گنتی کی ایک چھوٹی سی جماعت کے علاوہ باقی لوگوں کو مومن بھی نہیں سمجھتے تھے مگر دوسری طرف مرجیئہ نے انتہائی تساہل سے کام لے رکھا تھا۔ جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں وہ بنو امیہ شیعان علی، خوارج، غرضیکہ کسی ایسے آدمی کو جو شہادتین کا اقرار کرتا ہو کافر قرار نہیں دیتے تھے۔ بلکہ حد یہ ہے کہ وہ اخطل کے کفر کا فیصلہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کرتے تھے۔ ایسے ہی النصاریٰ اور یہود کے متعلق (بھی) وہ کوئی حتمی فیصلہ دینے کے لئے تیار نہیں تھے کیونکہ ایمان کا تعلق دل سے ہے۔ اور دل کے حال پر خدا کے سوا کوئی خبردار ہو سکتا ہے۔ لہٰذا وہ تمام لوگوں سے امن و آشتی کے قائل تھے۔ اس نظریہ نے ——— جیسا کہ زید بن علیؓ نے فرمایا ہے ——— فساق و فجور میں بھی خدا کی معافی کی طمع پیدا کر دی تھی۔ (باقی آئندہ)

موذی امراض سے نجات

مُفت حاصِل کیجئے!

(۱) زنگاری سرمہ۔ دمہ۔ درد گردہ و پتھری کی مجرب دوائیاں۔ اور (۲) پائیوریا جریان۔ دانت و مسوڑھے کا درد۔ مونگری پھوڑا کے مجرب نسخے حسب ذیل پتہ پر ایک کارڈ لکھ بھیجئے۔ ساتھ ہی مرض کی کیفیت سے بھی آگاہ کیجئے۔

حاجی محمد دین۔ شیخ آئل فیکٹری۔ اورنج اسٹریٹ۔ لارنس کوارٹرز۔ کراچی

رابطۂ باہمی

پرویز صاحب کا دورۂ سمندری

بزم طلوع اسلام سمندری (ضلع لائلپور) کی دعوت پر ۲۰ نومبر کو محترم پرویز صاحب اپنے رفقاء (چوہدری عبدالرحمٰن صاحب، لطیف نظامی صاحب، ڈاکٹر احمد حسن صاحب) کی معیت میں سمندری پہنچے اور بعد نماز عشاء اسلامیانِ شہر و مضافات کے ایک نمائندہ اجتماع سے خطاب کیا۔ خطاب کا موضوع تھا "روٹی کا مسئلہ اور اس کا قرآنی حل"۔ تلاوتِ قرآن کریم کے بعد صدر جلسہ محترم صفدر سلیمی صاحب نے بڑے دلکش انداز میں مقرر کا تعارف کرایا۔ اس کے بعد پرویز صاحب نے اپنے مخصوص اور دلنشیں انداز میں معاشی مسئلے کی اہمیت واضح کی اور پھر قرآن کریم کی روشنی میں عہدِ رسالت اور خلافتِ راشدہ کی درخشندہ مثالوں سے اس کا حل پیش کیا۔ اور حاضرین کے سامنے یہ حقیقت نکھر کر آ گئی کہ قرآن ہماری زندگی کے اہم ترین مسائل کو کس حسین پیرائے میں حل کرتا ہے۔ تقریر کی جامعیت اور اطمینان بخش ہونے کی یہ کیفیت تھی کہ حاضرین کو کسی سوال پوچھنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ اور وہ معاشی مسئلہ کی دینی اہمیت اور قرآن کریم کی عالم آرا حکمت و عظمت کے درخشندہ نقوش دلوں میں لے کر رخصت ہوئے۔ اس سے قبل پرویز صاحب کے خلاف اس قصبہ میں غلط فہمیوں اور بہتان طرازیوں کا ایک بے پناہ سلسلہ قائم کیا گیا تھا۔ اس تقریر سے اس کے تمام پردے چاک چاک ہو کر رہ گئے۔ قصبہ کے باشعور لوگ اس خطاب سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ اگلی صبح طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی معززینِ شہر کے مختلف گروہ پرویز صاحب کی قیام گاہ پر پہنچنے شروع ہو گئے اور مسلسل تین گھنٹے تک (جبکہ پرویز صاحب کو لاہور آنا تھا) یہ مجلس جمی رہی۔ دین کے معاملہ میں کئی اہم مسائل اس مجلس میں سامنے آئے اور پرویز صاحب نے ان کی وضاحت اس دلنشیں اور علمی انداز میں کی کہ جو بھی رخصت ہوا فکرِ قرآن کی علمی عظمت کا گہرا اثر لے کر گیا۔ محترم چوہدری نذیر احمد صاحب اور ان کے رفقاء کار دلی شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے قرآنی فکر کی اشاعت کے لئے اس اجتماع کے انتظامات نہایت خوش اسلوبی سے کئے۔

رپورٹیں

گوجرانوالہ

پندرہ روزہ اجتماع باقاعدگی سے ہو رہے ہیں۔ مقامی احباب کے علاوہ مضافات کے احباب بھی ان

اجتماعات میں شریک ہوتے ہیں۔ ابھی ابھی تین نئے احباب شاملِ بزم ہوئے ہیں۔ اور چار اصحاب نے طلوع اسلام کی خریداری قبول کی ہے۔ خواجہ محمد حسین (سابق نمائندہ بزم) اب ترجمان ضلع مقرر ہوئے ہیں۔ اور ان کی جگہ بزم کی نمائندگی شیخ محمد اقبال (گلف آئل لمیٹڈ اندرون ٹھاکر دروازہ) کے حصے میں آئی ہے۔ (ضرورت مند احباب لٹریچر اور دیگر ضروریات کے سلسلے میں شیخ صاحب سے مذکورہ ایڈریس پر رابطہ قائم کریں)

رسول نگر (ضلع گوجرانوالہ)

نماز جمعہ کے بعد اراکینِ بزم اور معززین قصبہ کا اجتماع خان بہادر قاضی حفیظ الدین (نمائندہ مقامی بزم) کے دولت کدہ پر ہوا۔ ترجمان ضلع خواجہ محمد حسین اور شیخ محمد اقبال صاحبان نے اس اجتماع میں طلوع اسلام کے مسلک و مقصد اور اسلامک آئیڈیالوجی کے مختلف نکات پر بالوضاحت روشنی ڈالی۔ لٹریچر کی تقسیم اور شام کی چائے کے بعد یہ اجلاس کامیاب طور پر اختتام پذیر ہوا۔

پشاور شہر

لٹریچر کی تقسیم باقاعدگی سے ہو رہی ہے۔ باہر کے احباب طلوع اسلام کے مسلک و مقصد سے متعلق مضامین کی اخبارات میں اشاعت کے لئے مرزا علی احمد خاں (۴۳۴۔ اسکندر پورہ۔ پشاور) سے رابطہ قائم کریں۔

ہنگو (ضلع کوہاٹ)

بزم نے مین بازار کی ایک بالائی منزل میں اپنا دفتر قائم کر لیا ہے اور لائبریری کے قیام میں کوشاں ہے۔ ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے ہو رہے ہیں اور لٹریچر کی تقسیم بھی۔ ادارہ کی مطبوعات سے عوام کی دلچسپی روز افزوں ہے۔

راولپنڈی

ہفتہ وار اجتماعات باقاعدگی سے جاری ہیں۔ ان میں نئے نئے اصحاب کو دعوتِ شرکت دی جاتی ہے اور سب پرویز صاحب کی ٹیپ ریکارڈ شدہ تقاریر سے مستفید ہو رہے ہیں۔ پمفلٹس کی تقسیم بھی ہو رہی ہے۔

مری

قرآنی فکر کی نشر و اشاعت کے نقطۂ نظر سے خاص مری میں پندرہ روزہ اجلاس ہوتے ہیں۔ عام اجلاس مضافات کے دیہات میں کئے جاتے ہیں اور پمفلٹس کی تقسیم کے ساتھ ساتھ وہاں کے نوجوانوں کو دعوتِ عام دی جاتی ہے۔

جام پور (ضلع ڈیرہ غازی خاں)

حکیم غلام بخش کی نقل مکانی کے بعد بزم کی نمائندگی میاں ظہور احمد خاں (رئیس اعظم جام پور) نے سنبھالی ہے۔ طلوع اسلام کے نئے خریدار بنانے پر خاص توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

شیخوپورہ

گذشتہ ایک ماہ میں ڈیڑھ صد کے قریب پمفلٹ تقسیم کئے گئے ہیں۔ بزم کی لائبریری کے لئے ساٹھ روپے کی کتابیں خریدی گئیں۔ طلوع اسلام کے مسلک و مقصد کے تعارف اور اشاعت کے سلسلہ میں اراکینِ بزم نے چک ۴۷ (سینی بار) کا کامیاب دورہ کیا۔ عنقریب وہاں بزم کا قیام عمل میں آجائے گا۔

چنیوٹ (ضلع جھنگ)

راولپنڈی کے اجتماع کے بعد سے بزم نئے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار ہوئی ہے۔ ادارہ طلوع اسلام کی مطبوعات کے مطالعہ کا شوق بڑھ رہا ہے۔ اور بزم کی لائبریری عوام کے اس ذوق و شوق کو بحسن و خوبی پورا کر رہی ہے۔

(دیگر مقامات کی رپورٹیں تادمِ تحریر موصول نہیں ہوئیں۔ بزموں سے تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اپنی رپورٹیں جلد از جلد بھیجا کریں۔)

درسِ قرآن

لاہور (۲۵۔ بی گلبرگ) میں پرویز صاحب کے درسِ قرآن کا سلسلہ باقاعدگی سے جاری ہے۔ اور حاضرین کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس درس کی اہمیت اور مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہفتہ بھر تک شہر کے مختلف گوشوں میں اس کا چرچا ہوتا رہتا ہے۔ آئندہ چند نشستوں میں بعض بڑے اہم عنوانات سامنے آ رہے ہیں۔ مثلاً اسلام آگے کیوں نہ چلا؟ قرآنی نظامِ حکومت کیا ہے؟ اسلامی آئین کسے کہتے ہیں؟ مستقل اقدار کیا ہیں؟ باہر سے آنے والے احباب اگر چاہیں تو ہر سوموار یا منگل وار تک خط لکھ کر معلوم کر لیا کریں کہ آئندہ اتوار کو درس کا موضوع کیا ہوگا؟

خطوط میں ضروری احتیاط

(قابلِ توجہ بزمہائے طلوعِ اسلام)

بزمہائے طلوعِ اسلام اور مختلف اصحاب کی جانب سے جو خطوط موصول ہوتے ہیں ان میں اکثر و بیشتر ایسے امور کا تعلق ادارہ کے مختلف شعبوں سے ہوتا ہے ایک ہی پرچے میں درج کر دیئے جاتے ہیں جس کی وجہ سے تعمیل میں دقت اور تاخیر واقع ہو جاتی ہے۔ اس مشکل کا علاج یہ ہے کہ متعلقہ بزمیں اور دیگر احباب خطوط لکھنے میں اتنی احتیاط برتیں کہ مختلف امور کا تذکرہ علیحدہ علیحدہ پرچوں میں کریں۔ اور سب پرچے ایک ہی لفافہ میں بند کر کے ادارہ کو بھیجدیں تاکہ ہر پرچہ پر متعلقہ شعبہ بعجلت کارروائی کر سکے۔ (ناظم ادارہ)

"پاکستان میں کوئی بھوکا نہ رہے" (انگریزی پمفلٹ) قیمت۔ چار آنے

طلوعِ اسلام کے پرانے پرچے

(۱) اگر کسی کو مندرجہ ذیل شماروں کی ضرورت ہو تو چار آنے فی پرچہ خرچ ڈاک ارسال کر کے طلب فرمائیں۔

ہفتہ وار:۔ (جلد ۸) شمارہ نمبر ۱، ۱۰، ۱۵، ۱۶، ۱۸، ۲۰، ۲۲، ۲۴ (دو عدد) ۲۸، ۴۰، ۴۱، ۴۵، ۴۷، ۴۹۔

ماہوار:۔ جون ۱۹۵۱ء (صفحہ ۵ سے صفحہ ۵ تک)۔ اپریل ستمبر ۵۲ء۔ ستمبر ۵۴ء۔ جنوری، فروری، مئی، نومبر ۵۶ء۔ مئی، اگست، ستمبر، اکتوبر ۵۷ء۔ مارچ، اپریل، مئی ۱۹۵۸ء۔ اپریل جون۔ اگست۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء۔

(۲) جن احباب یا بزموں کے پاس فالتو رسالے ہوں وہ بذریعہ رجسٹرڈ پیکٹ مجھے ارسال کر دیں۔ تاکہ مستحق اور ضرورت مند احباب مستفید ہو سکیں۔ خرچ ڈاک، روانہ کر دیا جائے گا۔ (خواجہ محمد حسین (ترجمان ضلع) حاجی پورہ گوجرانوالہ)